Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1972

طلوعِ اسلام کنونشن میں

پرویز صاحب کا معرکہ آرا خطاب

"مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا"

(اندر کے صفحات پر)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ-لاہور

قیمت فی پرچہ [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک
پاکستان
سالانہ ——— دس روپے
غیر ممالک
سالانہ ——— ایک پونڈ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط وکتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵-بی، گلبرگ ۲، لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

جلد (۲۵) — دسمبر ۱۹۷۲ء — نمبر (۱۲)

فہرست

(۱) لمعات ——— ۲

(۲) ہم عید کیوں مناتے ہیں؟ ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۹

(۳) مجھے آہ وفغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا ——— (محترم پرویز صاحب) ۲۵

(۴) تفہیم القرآن (جلد اول، مولانا مودودی) پر ایک نظر (شاہ عادل) ۴۹

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: سراج الحق، مقامِ اشاعت: ۲۵-بی، گلبرگ ۲، لاہور، پرنٹر: شیخ محمد اشرف، مطبوعہ: اشرف پریس، ایبک روڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کچھ کم ہوئی تھیں دل کے دھڑکنے کی کاوشیں
پھر آگیا وہ زلف پریشاں لئے ہوئے

تحریکِ پاکستان کے دوران (بالخصوص اس کے آخری دور میں) صورت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ ہندو کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ وہ جاتے وقت اقتدار متحدہ ہندوستان کے ہاتھ میں دے جائے جس کا عملی مفہوم یہ تھا کہ وہاں کی پوری آبادی پر ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جائے اور اس طرح وہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام محکوم مسلمانوں سے لیتا چلا جائے۔ تحریکِ پاکستان (یا بالفاظ دیگر قائد اعظمؒ) کی کوشش یہ تھی کہ اگر ہم ہندوستان کے سارے کے سارے مسلمانوں کو ہندو کی غلامی سے نہیں بچا سکتے تو کم از کم ان خطوں کے مسلمانوں کو تو اس عذاب سے بچا لیں جن میں ان کی آبادی کی اکثریت ہے۔ ان خطوں کی ایک الگ مملکت قائم کر لی جائے۔ جس میں مسلمان نہ صرف ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کر لے بلکہ اپنی اسلامی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر سکے۔ مسلمانوں کے اس مطالبہ کی مخالفت (ہندوؤں کے علاوہ) نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے بھی ہوتی تھی۔ لیکن ان کا موقف اس قدر کمزور تھا کہ عوام ان کے فریب میں نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن اس تحریک کی مخالفت ایک اور گوشے کی طرف سے بھی ہوتی تھی اور اس مخالفت کا انداز بظاہر اس قدر معصوم اور معقول تھا کہ اگر اس کی نقاب کشائی نہ کی جاتی تو عوام کا اس کے فریب میں آ جانا چنداں بعید نہیں تھا۔ یہ مخالفت تھی جماعت اسلامی کی طرف سے۔ اس کے امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا پراپیگنڈہ یہ تھا کہ

(۱) تحریکِ پاکستان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام کا احیاء کریں گے۔

(۲) مملکتِ پاکستان میں (اگر وہ متشکل ہو گئی تو) نظامِ حکومت بہرحال جمہوری ہوگا۔

(۳) جمہوری نظام کے معنی یہ ہوں گے کہ اقتدارِ حکومت عوام کی اکثریت کے ہاتھ میں ہوگا۔

(۴) مسلمانوں کی اکثریت کی جو اخلاقی حالت ہے اس کے پیشِ نظر بنہایت آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی قائم کردہ حکومت کس حد تک اسلامی ہوگی۔

(۵) لہٰذا نہ یہ تحریک اسلامی ہے اور نہ ہی اس کی حاصل کردہ مملکت اسلامی بن سکے گی۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ پہلے قوم کی اصلاح کی جائے۔ انہیں سچے معنوں میں مسلمان بنایا جائے۔ اور جب وہ ایسے بن جائیں تو پھر اپنی مملکت قائم کرنے کا خیال کیا جائے۔

جب ان سے کہا جاتا کہ ہندوستان کی سیاست میں جس تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں ان کے پیشِ نظر اگر ہم اس کا انتظار کرتے رہے کہ پہلے قوم صحیح معنوں میں مسلمان بن جائے اور اس کے بعد اپنی مملکت قائم کرنے کا سوال اٹھایا جائے تو چند دنوں کے بعد جب اقتدار بالکلیہ ہندو کے ہاتھ میں آجائے گا تو وہ خطہ ہی کون سا ہوگا جس میں ہم اپنی حکومت قائم کر سکیں گے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے تھے کہ تم الگ خطہ کی بات کر رہے ہو' اس وقت ہم سارے ہندوستان پر حکومت کر سکیں گے۔

یہ تھا اس جماعت اور اس کے امیر کا، تحریکِ پاکستان کی مخالفت کا انداز! آپ نے دیکھا کہ یہ حربہ کس قدر پُرفریب تھا؟ اگر قوم اُس وقت اُن کے فریب میں آجاتی تو جو حشر اِس وقت ہندوستان میں رہ جانیوالے مسلمانوں کا، یا مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کا ہو رہا ہے' وہی حشر پورے کے پورے مسلمانوں کا ہوتا! ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے' مناسب ہے کہ اس کی تائید میں خود مودودی صاحب الفاظ سامنے لائے جائیں۔ انہیں غور سے سنیئے۔ وہ کہتے تھے۔

> یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں موجود ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ ص۵۵)

بنیاد کی اس پہلی اینٹ کو مسلسل اور متواتر دہرائے جانے کے بعد' وہ اگلا ردّا اس طرح رکھتے تھے کہ

> ان (تحریک پاکستان کے مؤیدین) کی تجویز یہ ہے کہ پہلے اسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے۔ پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظامِ حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے...... لیکن ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حکومتِ جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام' آخر کار حاکمیتِ ربّ العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ (ایضاً ص۲۷)

ایسا کیوں ہوگا! اس کی دلیل ملاحظہ فرمایئے۔ کہتے تھے۔

> جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا' قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا...... پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ دینی قائم ہو جائے گی' ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ ص۱۹)

جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ پھر ان مسائل کا حل کیا ہے جو مسلمانوں کے درپیش ہیں تو جواب میں فرماتے ہیں

> اگر مسلمان سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے اور اس میں

ایک لادینی جمہوری حکومت یا عوامی پارلیمنٹری حکومت نہیں' بلکہ خالص خدا کی حکومت کتاب و سنت کے اصول پر قائم ہو سکتی ہے۔

یہ بات انہوں نے ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو ٹانک میں اسلامی جماعت کے ایک اہم اجلاس میں کہی تھی جس کی روئداد اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔

ان اقتباسات سے آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کا موقف کیا تھا اور وہ کن دلائل کی بنا پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کے موقف کا ملخص یہ تھا کہ پہلے قوم کو سچا مسلمان بنانا چاہیئے اس کے بعد حکومت حاصل کرنی چاہیئے۔ اگر قوم کو مسلمان بنائے بغیر حکومت قائم کرلی تو وہ حکومت کبھی اسلامی نہیں ہو سکے گی۔
آپ جماعتِ اسلامی کے ارکان کو ہر جگہ یہ کہتے سنیں گے کہ تم نے دیکھ لیا کہ ہمارے امیر جو کچھ کہتے تھے وہ کس طرح حرف بحرف درست ثابت ہوا۔ تم نے قوم کو سچے مسلمان بنائے بغیر حکومت قائم کرلی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ قوم بد سے بدتر ہوتی چلی گئی یہاں تقسیم ہند سے پہلے اتنی خرابیاں نہیں تھیں جتنی خرابیاں آج ہیں۔ یہ ہوتا ہے قوم کے اخلاق سنوارنے سے پہلے حکومت قائم کرنے کا نتیجہ۔ یہاں جتنی حکومتیں آج تک قائم ہوئی ہیں وہ بھی اسی لئے خراب تھیں کہ اس قسم کی بگڑی ہوئی قوم کی جمہوری حکومت کبھی اصلاح یافتہ نہیں ہو سکتی۔ زہریلے دودھ کا مکھن ہمیشہ زہریلا ہوگا۔

اب آئیے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں جماعتِ اسلامی کے طرزِ عمل کی طرف۔ یہ ظاہر ہے (اور اس کا اعلان خود اس جماعت کے ارکان کرتے رہتے ہیں) کہ یہاں قوم کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ اس میں اخلاقی خرابیاں اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہیں ____
اب آگے بڑھیئے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے مودودی صاحب نے یہاں بحالیٔ جمہوریت کی تحریک چلائی اور اسے جہادِ عظیم قرار دیا اور اس میں کامیابی کو اپنی سب سے بڑی اسلامی خدمت کہہ کر پکارا۔ اسلامی جماعت کے ارکان اپنی اس فتحمندی پر پھولے نہیں سماتے۔
آپ نے اس پر غور بھی کیا کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ خود ان حضرات کے قول کے مطابق قوم کی اخلاقی حالت بدترین ہو چکی ہے لیکن اسی قوم کی اکثریت سے حکومت قائم کئے جانے والے نظامِ جمہوریت کو عین مطابقِ اسلام قرار دیا جا رہا ہے۔ اب زہریلے دودھ سے زہریلا مکھن نہیں نکلتا۔
اور آگے بڑھیئے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ ساری خرابیاں قوم کی ہیں۔ جب تک قوم درست نہیں ہوگی، حکومت بھی کسی قسم کی اصلاح نہیں کر سکے گی۔ اور اب کیا ارشاد ہوتا ہے! اسے بھی غور سے سنئے۔
حال ہی میں مودودی صاحب نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے۔
حکومت کی خرابی ____ سب خرابیوں کی جڑ ہے۔

اور اس کا پہلا فقرہ یہ ہے کہ
دنیا میں آپ جتنی خرابیاں بھی دیکھتے ہیں' ان کی جڑ دراصل حکومت کی خرابی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔

> یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے جس کو سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ غور و فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ اصلاحِ خلق کی کوئی اسکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی۔

آپ نے دیکھا کہ مودودی صاحب جو کچھ تحریکِ پاکستان کے دوران کہتے تھے' اب کس طرح خود ہی اس کی تردید کر رہے ہیں۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ یہ حضرت اپنے اُس وقت کے موقف کو بھی عین اسلام کہتے تھے اور اُس کی ضد موجودہ مسلک کو بھی تقاضائے اسلام قرار دیتے ہیں۔

یہ تو ہوئی پہلی بات۔ یعنی "اقامتِ دین" کے دعاوی کا ملخص ہے حکومت کی کرسیاں سنبھالنا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے طریقِ کار کیا ہوگا؟ ۱۹۷۰ء میں اس جماعت کے ذہن میں یہ زعمِ باطل سما رہا تھا کہ ہم اتنے پاپولر ہو گئے ہیں کہ انتخاب کے ذریعے اکثریت حاصل کر لیں گے اس لئے اُس وقت بجائے جمہوریت کی تحریک چلائی گئی اور جمہوریت کو عین اسلام قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابی نتائج نے اس فریب کا پردہ چاک کر دیا اور انہیں اپنی حیثیت معلوم ہو گئی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اُن انتخابات میں عبرت آموز اور خفت انگیز شکست کے بعد مودودی صاحب نے اپنی جماعت کے کارکنوں سے فرمایا تھا کہ اس شکست سے دل برداشتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اب ہمارا طریقِ کار دوسرا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس طریق کے ابتدائی مراحل طے پا چکے ہیں اور اب وہ سینوں سے ابھر کر زبانوں پر آ رہا ہے۔ چنانچہ پچھلے ماہ (اکتوبر میں) امیر جماعتِ اسلامی صوبہ پنجاب' اسعد گیلانی صاحب نے فرمایا تھا۔ کہ

> ہم اس مرحلہ پر یہ بات واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر ملک کے آئین میں اسلامی قوانینِ شریعت کے اجراء اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کی ضمانت نہ دی گئی تو جماعت اسلامی فی الحقیقت ملک بھر میں ایسی تحریک چلائے گی جس کی لہر خیبر سے کراچی تک جائے گی۔
>
> (نوائے وقت۔ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۷۲ء)

سال گذشتہ (۷ر نومبر ۱۹۷۱ء کو) جماعتِ اسلامی نے یومِ بدر منایا۔ اس تقریب پر ایک صاحب نے میاں طفیل محمد صاحب سے سوال کیا کہ انتخابات کے نتائج نے بتا دیا ہے کہ اسلام جمہوری طریقہ سے غالب نہیں آ سکتا۔ غلبۂ اسلام کے لئے غیر جمہوری طریقہ ہی مفید رہیگا۔ اس کے جواب میں میاں صاحب نے فرمایا تھا کہ

> اس بات کو ذہن سے نکال دیجئے کہ اسلامی نظام غیر جمہوری طریقوں سے بھی قائم ہو سکتا ہے۔ غیر جمہوری طریقوں سے کوئی اور نظام خواہ قائم ہو جائے لیکن اس سے اسلامی نظام کا قیام ہرگز ممکن نہیں۔ اللہ تعالٰے نے دین کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسلط کرنے کا حکم نہیں دیا۔ (ایشیا۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۷۱ء)

یہ نومبر ۱۹۷۱ء کا اسلام تھا۔ اب وہی میاں صاحب فرماتے ہیں کہ:

> چند لوگ ہمیں کمزور تصور کرتے ہیں لیکن جب وقت آیا اور ہم نے اقتدار سنبھالنے کا ارادہ کر لیا تو یہ لوگ تو کیا' امریکہ' بھارت اور روس مل کر بھی ہماری طاقت کے سامنے ایک منٹ نہیں ٹھہر سکیں گے۔ مشرقی پاکستان میں جماعت کے پانچ سو کارکن تھے لیکن انہوں نے اس نازک دور میں بھی اپنی بھرپور طاقت کا لوہا منوا لیا۔ یہاں جماعت کے چند ہزار کارکن ہیں لیکن ہم کمزور ہرگز نہیں ہیں اور جب وقت آیا تو لوگوں کو ہماری طاقت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ جماعتِ اسلامی کی تحریک پوری دنیا میں پھیل

چکی ہے۔ اسلامی سوشلسٹ ممالک میں بھی ہمارے کارکن خفیہ طور پر کام کر رہے ہیں۔
(جماعتِ اسلامی کی مسجد کی بنیاد رکھتے وقت تقریر)
(بحوالہ۔ امروز۔ ۸ر نومبر ۱۹۷۲ء)

اور جماعتِ اسلامی کے لئے یہ کوئی نیا طریق کار نہیں۔ مودودی صاحب نے آج سے تیس پینتیس سال پہلے اسلامی انقلاب کے سلسلہ میں کہہ دیا تھا کہ اسلام پہلے اپنے آدمیوں کو اس کے لئے تیار کرتا ہے اور جب وہ تیار ہو جاتے ہیں تو ان سے کہتا ہے کہ:

ہاں! اب تم روئے زمین پر خدا کے سب سے صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو اور لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (خطبات ص ۲۳۵۔ ایڈیشن ۱۹۵۹ء)

اسی بات کو مودودی صاحب نے اب اپنے مذکورہ صدر پمفلٹ میں ان الفاظ میں دہرایا ہے کہ

جو لوگ خلقِ خدا کو لوٹتے اور اخلاق کو تباہ کرتے ہیں۔ ان کو آپ محض پند و نصیحت سے چاہیں کہ اپنے فائدوں سے ہاتھ دھو لیں تو یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ ہاں، اقتدار ہاتھ میں لے کر آپ بزور ان کی شرارتوں کا خاتمہ کر دیں تو ان ساری خرابیوں کا انسداد ہو سکتا ہے۔

اب یہ بات صاف ہو گئی کہ انتخابات میں شکست کھانے کے بعد اس جماعت نے اپنے مستقبل کے لئے جو نیا لائحہ عمل تجویز کیا تھا وہ کیا تھا۔ وہ تھا طاقت کے زور سے حکومت پر قابض ہونا۔

اور اس مقام پر ہمارا روئے سخن ارباب حکومت کی طرف ہے۔ جماعتِ اسلامی کے پاس کوئی مثبت پروگرام نہیں ہوتا۔ ان کی روزِ اول سے آج تک کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انہوں نے کوئی مثبت پروگرام اپنے سامنے نہیں رکھا۔ "اقامتِ دین" کا ایک مبہم جذباتی نعرہ ہے جو یہ لوگ مسلسل بلند کرتے چلے آ رہے ہیں اور اسی سے عوام کو فریب دیتے ہیں۔ انہوں نے آج تک یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ دین ہے کیا جس کی اقامت کے لئے یہ مصروفِ جد و جہد رہتے ہیں ـــــ دین ان کا ہر مصلحت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ بہرحال ان کے پاس کوئی مثبت پروگرام نہیں ہوتا۔ پروگرام ان کا ہمیشہ منفیانہ ہوتا ہے یعنی دوسروں کے خلاف پروپیگنڈا، اور اس کے ذریعے نفرت پھیلانا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعلان میاں طفیل محمد صاحب نے بڑے فخر سے کیا جب نا صر باغ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

حکومت کے خلاف نفرت پھیلانا صرف ہمارا حق نہیں بلکہ ہمارا دینی اور قومی فریضہ ہے اور ہم نفرت پھیلانے سے باز نہیں آئیں گے　　(مساوات۔ ۲۶ر اگست ۱۹۷۲ء)

"نفرت پھیلانا" ـــــ بس یہ ہے ان کی ٹیکنیک۔ ان کے اس حربہ کا توڑ یہ ہے کہ ہم میں کوئی خرابی نہ ہو یا ہم کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے انہیں نفرت پھیلانے کا موقعہ ملے۔ یہ درست ہے کہ یہ لوگ دوسروں کے خلاف جھوٹے الزامات بھی وضع کر لیتے ہیں کیونکہ (مودودی صاحب کے فتوے کے مطابق) زندگی کے اہم مصالح کی خاطر جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہو جاتا ہے لیکن اس قسم کے الزامات کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ جھوٹ چند دنوں کے بعد خود ہی مر جاتا ہے۔ انہوں نے قائداعظمؒ کے خلاف نفرت پھیلانے کی امکان بھر کوشش کی۔ لیکن

چونکہ ان کا کردار بہت بلند تھا اس لئے اس چاند پر تھوکا ان کے اپنے منہ پر گرا۔ انہوں نے طلوع اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن وہ بے بنیاد تھا اس لئے ان کا پروپیگنڈہ کوئی مثبت نتیجہ مرتب نہ کر سکا لیکن جہاں کچھ تھوڑا بہت پانی مرتا ہو وہاں ان کا پروپیگنڈہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

موجودہ حکومت کے متعلق طلوع اسلام کا مسلک واضح ہے۔ ہم ان کی کوتاہیوں اور خرابیوں پر برابر تنقید کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ابھی تک اسے پاکستان کی آخری امید سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس کے استحکام کے دل سے خواہاں ہیں۔ ان کے اسقام و نقائص کے خلاف ہماری تنقید کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ اپنی غلطیوں کی بروقت اصلاح کر لیں تاکہ اس کے استحکام میں فرق نہ آنے پائے۔ اسی نیت سے اور اسی مقصد کے پیش نظر ہم صدر بھٹو سے گزارش کریں گے کہ وہ ذرا رک کر اپنی حکومت کی اس (قریباً) یکسالہ کارکردگی پر نگہ احتساب ڈالیں اور دیکھیں کہ اس سے کیا کیا کوتاہیاں ہوئی ہیں اور جن ارباب حکومت کو اختیارات دیئے گئے تھے۔ انہوں نے ان کا کس طرح استعمال کیا ہے۔ ان کی دیانت، امانت، رفتار، گفتار، کردار کا اندازکیا رہا ہے کہ حکومتوں کے استحکام پر ان سب امور کا اثر پڑتا ہے۔ وہ نہایت ٹھنڈے دل سے بنظر غائر ان تمام امور کا جائزہ لیں اور پھر دیکھیں کہ کہیں پانی تو نہیں مر رہا۔ اگر انہوں نے ان نقائص و اسقام کی بروقت اصلاح کرلی تو پھر ایک چھوڑ ہزار جماعت اسلامی اور اس کی نفرت انگیز مہمات اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا، تو پھر انہیں نفرت پھیلانے کے ایسے مواقع ہاتھ آجائیں گے جن کا کوئی توڑ نہیں ہوگا۔ اس سے معاشرہ میں خلفشار رونما ہوگا اور وہی کیفیت پیدا ہو جائے گی جو ۶۹-۱۹۶۸ء میں ہوئی تھی۔ اگر ایسا ہوا تو پاکستان اس دھچکے کا متحمل نہیں ہو سکیگا۔ ہم اتنا عرض کر دیں کہ اس وقت معاشرہ کے جو حالات ہیں وہ جماعت اسلامی کی نفرت پھیلانے کی مہم کے لئے بڑے سازگار ہیں اور اسی لئے یہ لوگ اب نکھر کر سامنے بھی آ رہے ہیں۔

خدا کرے کہ صدر محترم تک ہماری یہ گزارشات پہنچ جائیں اور وہ پاکستان کو اس قسم کی شر انگیزیوں سے بچا لیں۔

(۳)

جیسا کہ سابقہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا طلوع اسلام کی کنونشن ۲۳ لغایت ۲۶ نومبر کو منعقد ہو رہی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس پرچہ میں اس کی روئیداد پیش نہیں کر سکتے کیونکہ پرچہ کنونشن کے انعقاد سے بھی پہلے پریس میں چلا جائے گا۔ البتہ ہم کنونشن کے کھلے اجلاسوں کا پروگرام درج ذیل کرتے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ کنونشن میں کون کونسے مسائل سامنے لائے گئے تھے۔

کنونشن کے کھلے اجلاسوں کا پروگرام

۱۔ پہلا اجلاس :۔ بروز جمعرات ۔ مورخہ ۲۳ نومبر ۔ بوقت ۵ بجے شام

۱۔ استقبالیہ :۔ مفکر قرآن جناب پرویز

عنوان :- **مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا**

۲- **دوسرا اجلاس** :- بروز جمعہ - مورخہ ۲۴ر نومبر - بوقت ۲ بجے (بعد نماز جمعہ)

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

(۱) قانون کا احترام - (۲) پاکستان کی تعلیمی پالیسی - (۳) تہذیب فرنگ -

محترمہ (مس) شمیم انور جو حال ہی میں کینیڈا، امریکہ، یورپ سے واپس آئی ہیں اپنے تاثرات پیش کرینگی (بزبانِ انگریزی)

۳- **تیسرا اجلاس** :- بروز جمعہ - مورخہ ۲۴ر نومبر - بوقت ۵½ بجے شام

پرویز صاحب کا خطاب - جس کا موضوع ہے

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

۴- **چوتھا اجلاس** :- بروز ہفتہ - مورخہ ۲۵ر نومبر - بوقت ۲ بجے دوپہر

بزمِ مذاکرہ

موضوع :- ـــــــــ ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار

انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

کنونشن کا یہ مذاکرہ بڑا دلچسپ، بصیرت افروز اور حقیقت کشا ہوتا ہے جس میں قوم کا نوجوان طبقہ بالخصوص اساتذہ، طلبا اور طالبات حصہ لیتے ہیں اور آداب خود آگاہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے پوری آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

۵- **پانچواں اجلاس** :- بروز ہفتہ - مورخہ ۲۵ر نومبر - بوقت ۹ بجے شب

مجلس استفسارات

اپنے انداز کی منفرد نشست جس میں پرویز صاحب زندگی کے اہم عملی مسائل سے متعلق آپ کے ارسال کردہ سوالات کا جواب قرآن مجید کی روشنی میں دیتے ہیں۔ اس ایک نشست میں زندگی کے سینکڑوں عنوانات نکھر اور ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور ذہنوں کو شکوک و شبہات سے پاک کر دیتے ہیں۔

۶- **چھٹا اجلاس** :- بروز اتوار - مورخہ ۲۶ر نومبر - بوقت ۹½ بجے صبح

پرویز صاحب کا خطاب جس کا عنوان ہے

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

(وقت کے اہم ترین سوال کا بصیرت افروز اور سکون بخش جواب)

ـــــــ (۰) ـــــــ

پرویز صاحب کے خطابات میں سے پہلا خطاب (استقبالیہ) چند صفحات آگے چل کر آپ کے سامنے آجائیگا باقی خطابات بعد کی اشاعتوں میں شائع کئے جائینگے۔ طلوع اسلام کا مشن ایک ہی ہے یعنی قرآنی نظامِ زندگی کا صحیح تصور قوم کے سامنے لاتے چلے جانا۔ ہمارا خیال ہے کہ قارئین ہم سے متفق ہونگے کہ (جیسا کہ پرویز صاحب نے اپنے استقبالیہ میں کہا ہے) وقت کا تقاضا ہے کہ اس فکر کو نہایت تیزی سے عام کیا جائے کہ اس کے بغیر پاکستان کے حفظ و بقا کی کوئی اور صورت نہیں۔

ـــــــ (۰) ـــــــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم عید کیوں مناتے ہیں؟

(پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم بتقریب سعید عید الفطر ——— یعنی جشنِ نزولِ قرآن)

عزیزانِ من! سلام و رحمت۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میرے آج کے خصوصی درس کا موضوع ہے ۔۔ ہم عید کیوں مناتے ہیں ۔۔۔ یہ موضوع بظاہر ایسا پیش پا افتادہ اور فرسودہ سا نظر آتا ہے کہ جب اس کا اعلان ہوا تو ایک صاحب سے نہ رہا گیا۔ وہ پوچھ ہی بیٹھے کہ اس موضوع کی اہمیت کیا ہے؟ کون نہیں جانتا کہ ہم عید کیوں مناتے ہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو ذرا آپ ہی فرما دیجئے کہ ہم عید کیوں مناتے ہیں؟ انہوں نے جھٹ سے کہا کہ ہم عید اس لئے مناتے ہیں۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ عید ہے۔ اسے منانا چاہیئے! کچھ توقف کے بعد انہوں نے کہا کہ یہ رمضان المبارک کے وداع ہونے کی خوشی میں عید منائی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ جمعۃ الوداع کو مسجدوں میں رو رو کر کہا جاتا ہے۔ الوداع اے ماہِ رمضان' الوداع۔ خطبوں میں اس کی جدائی پر بین کئے جاتے ہیں۔ نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ پکار پکار کر کہا جاتا ہے کہ

تیری فرقت میں جلتے ہیں سینے ۔ کیسے گذریں گے "یاراں" مہینے[1]

ستم ظریفی کی انتہا

رمضان المبارک کے وداع ہونے کے تصور سے ہم اس قدر اشک فشاں اور نوحہ کناں ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ وداع ہو جاتا ہے تو ہم اس خوشی میں عید مناتے ہیں! کبھی آپ نے سوچا بھی ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں؟ اور اگر کبھی رمضان المبارک کو ہماری نوحہ خوانی پر ترس آجاتا ہے اور وہ ازراہِ ہمدردی اور دلجوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ اچھا میرے دوستو! میں آپ کی خاطر ایک دن اور رک جاتا ہوں۔ میں ۲۹ کی بجائے ۳۰ کی شام کو چلا جاؤں گا۔ تو ہمارے ہاں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ عید کی آمد پر جوش تیاریوں پر اوس سی پڑ جاتی ہے۔ ہم دیدے پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہیں کہ کہیں سے چاند دکھائی دے۔ ہم ٹمبکٹو تک تاریں بھیجتے ہیں کہ رمضان المبارک کے وداع ہو جانے کی خوشخبری مل جائے۔ اور جب ہر طرف سے مایوسی ہو جاتی ہے۔ تو صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے بعد ہمیں

[1] ہماری غزلوں کی شاعری اسی قسم کی ہوتی ہے۔

کے چاند کی عیدیوں مناتے ہیں جیسے کسی نے بیگار میں پکڑ رکھا ہو۔ کیا عزیزانِ من! کبھی آپ نے سوچا بھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور ہم عید کیوں مناتے ہیں؟

دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے۔ ہم بھی سال کے مختلف دنوں میں بعض تیوہار مناتے ہیں لیکن اس عید

خدا کا مقرر کردہ تیوہار

کا تیوہار وہ ہے جسے بطورِ جشنِ مسرت منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ اس سے آپ اس تیوہار کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔ سورۃ یونس میں ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ - اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے ایک ضابطۂ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کے تمام نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں، سامانِ نشوونما اور منزلِ انسانیت تک پہنچنے کی راہ نمائی ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ - اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ ایسا عدیم النظیر ضابطۂ زندگی مل گیا ہے۔ تم کیا، اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا۔ لہٰذا! فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا۔ تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح بے مزد و معاوضہ مل جانے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ وہ متاعِ گراں بہا کہ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ - (۱۰/۵۸) انسان جو کچھ بھی جمع کرے، یہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ متاعِ کائنات سے زیادہ گراں بہا سامانِ زیست سے زیادہ بیش قیمت!

یہ ہے وہ تقریبِ جاں نواز جسے بطورِ جشنِ بہجت و مسرت منانے کی تاکید خدا نے کی ہے۔ یعنی جشنِ نزولِ قرآن۔ اور نزولِ قرآن کی ابتداء چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی۔ (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ - (۲/۱۸۵)۔ اس لئے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس جشن کی تیاریوں کے لئے تھا۔ اور عید الفطر اس جشن کی تکمیل کا دن

~~~~~~(۱)~~~~~~

قرآن نے ہمیں کیا دیا ہے؟

یہاں، ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالآخر ہمیں دیا کیا ہے جس کے لئے ہم سے جشنِ مسرت منانے کی تاکید کی گئی ہے۔ مذہب کی دنیا سے اس سوال کا جواب عجیب ملتا ہے۔ (میں عزیزانِ من! مذہب کی دنیا کہہ رہا ہوں۔ اسلام کی دنیا نہیں قرآن کی دنیا نہیں۔ دین کی دنیا نہیں۔ انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی دنیا، جس میں قرآن کو عجیبؔ غریب معانی پہنا دیئے گئے ہیں) اربابِ مذہب سے پوچھئے کہ انسان کی

مذہب کی دنیا کا جواب

پیدائش کا مقصد کیا ہے۔ تو وہ اس کے جواب میں جھٹ سے کہہ دیں گے کہ اس کا مقصد خود خالقِ کائنات نے بتا دیا ہے جب کہا کہ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۵۱/۵۶) خدا نے جن و انس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ (میں اس آیۂ جلیلہ کا صحیح مفہوم ذرا آگے چل کر عرض کروں گا) اب ذرا سوچئے اگر کوئی شخص (معاذ اللہ بفرمائیں) یہ کہے کہ اول تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں ہم سے پوچھے بغیر بھیج دیا۔ اور پھر کہا کہ ہم نے
~~~~~~

تمہیں اس لئے بھیجا ہے کہ تم ہماری عبادت کرو ۔ نماز پڑھو ۔ روزے رکھو ۔ حج کرو ۔ زکوٰۃ دو ۔ مشقتیں اٹھاؤ ۔ تکلیفیں برداشت کرو ۔ یہ کرو ۔ وہ نہ کرو ۔ ساری عمر جانکاہ پابندیوں میں بسر کرو ۔ ایسا کیوں کرو ؟ اس لئے کہ ہم تمہارے آقا ہیں اور تم ہمارے غلام ہو ۔ آقا غلام کو جو حکم دے اُسے اس کی تعمیل کرنی ہوگی ۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہیں جہنم میں بھیج دیا جائے گا ۔ یہ ٹھیک ہے ۔ غلام کو اپنے آقا کا ہر حکم ماننا ہوگا ۔ بالخصوص جب اس کی خلاف ورزی کی پاداش میں سامنے جہنم کا عذاب موجود ہو لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس پر وہ غلام جشنِ مسرت منائے گا ؟ خوشیوں کے شادیانے بجائے گا ؟

یہ جواب وہ ہے جو ہمیں مذہب کی دنیا سے ملتا ہے لیکن آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم کی بارگاہ سے ہمیں اس کا جواب کیا ملتا ہے کہ وہی جواب درحقیقت خدا کا جواب ہوگا ۔ قرآن کریم خدا اور انسان کے تعلقات کا تصور کچھ اور دیتا

قرآن کا جواب

ہے ۔ وہ انسان کی تخلیق کا مقصد کچھ اور بتاتا ہے اور ان پابندیوں کا مقصود کچھ اور قرآن خدا کی کتاب ہے ۔ اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ کتاب تو یہ خدا کی ہے مگر اس میں ذکر خود تمہارا ہے ۔ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ کِتٰبًا فِیۡهِ ذِکۡرُکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (۲۱/۱۰) ۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب بھیجی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے ۔ کیا تم اس بلند حقیقت پر غور نہیں کرتے ؟ عربی زبان میں لفظ ذکر کے ایک معنی تو وہی ہیں جو معنی ہم (اس لفظ کے) اردو زبان میں لیتے ہیں ۔ انہی معانی کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے اس حقیقت کو اس حسین انداز میں بیان کیا تھا کہ

محمدؐ بھی ترا ، جبریل بھی ، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

انسانی عظمت کا صحیفہ

قرآن درحقیقت انسان کا ترجمان ہے ۔ یہ ہے ذکر کا پہلا مفہوم لیکن اس لفظ کا ایک اور مفہوم بھی ہے یعنی شرف و عظمت ۔ عزت و توقیر ۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کتاب میں خود تمہارے شرف و عظمت کا راز پوشیدہ ہے ۔ یہ تمہیں عزت و توقیر اور احترام و تکریم کا مقام عطا کرنے کے لئے بھیجی گئی ہے ۔ اسی لئے دوسرے مقام پر کہا کہ ۔ بَلۡ اَتَیۡنٰهُمۡ بِذِکۡرِهِمۡ فَهُمۡ عَنۡ ذِکۡرِهِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۔ (۲۳/۷۱) ہم انہیں شرف و مجد کا مقام عطا کرتے ہیں اور ان کی حماقت دیکھو کہ یہ خود اپنے ہی شرف و احترام سے اعراض برتتے ہیں ۔ اس سے روگردانی کرتے ہیں ۔ یہ اس لئے کہ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ۔ (۳۳/۷۲) حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ظالم اور جاہل واقع ہوتا ہے ۔ یہ بربنائے جہالت خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے ۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کو الوہیاتی توانائی کا ایک شمہ دیا گیا ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے ۔ اس میں اس قدر وسیع ممکنات کی دنیا مضمر ہے کہ اس سے انسان زندگی کے بلند سے بلند ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ لیکن انسانی ذات کی یہ صلاحیتیں غیر نشوونما یافتہ شکل میں دی گئی ہیں اور اس دنیا کی زندگی اس کی نشوونما کا میدان ہے اقبال کے الفاظ میں ۔

مقامِ پرورش آہ و نالہ ہے چمن !
نہ سیرِ گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے

یہ پابندیاں کیوں ہیں

انسان کے لئے جس قدر پابندیاں تجویز کی گئی ہیں وہ اس کی ذات کی نشوونما اور ثبات و استحکام کا ذریعہ ہیں۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲/۲۸۶) خدا نے انسان پر جس قدر پابندیاں عاید کی ہیں وہ اس کی ذات میں وسعت پیدا کرنے کے لئے ہیں۔ ان سے خدا کوئی اپنا مقصد حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ وَ اللّٰہُ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ۔ خدا تمام کائنات سے مستغنی ہے اسے اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے کسی سے کچھ کام لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب انسان کے فائدے کے لئے قرآن کا ضابطہ خود انسان کے شرف و مجد کے جوہروں کی نمود اور اس کی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لئے ہے۔ لہٰذا خدا اور انسان کا تعلق (معاذ اللہ) ایک مستبد آقا اور بیگار میں پکڑے ہوئے غلام کا نہیں، یہ ایک مشفق معلم اور طالب علم کا تعلق ہے جس میں استاد کی ہدایات، محنت کی تاکید اور بعض اوقات سرزنش سطح بین نگاہوں کو سختی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت وہ متعلم کی صلاحیتوں کی نمود و پرورش کے پروگرام کی کڑیاں ہوتی ہیں۔

لہٰذا اگر ہم دو لفظوں میں سمجھنا چاہیں کہ قرآن کریم نے انسان کو کیا دیا ہے۔ اسکی تعلیم کا ماحصل کیا ہے اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ

یہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس نے کہا ہے کہ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۱)
اے رسول ہم نے یہ کتاب تیری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو اس کی تعلیم کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ ذرا سوچئے کہ تاریکی میں کیا ہوتا ہے اور روشنی اس کی جگہ کیا کرتی ہے۔ تاریکی میں کسی شے کا صحیح مقام متعین نہیں ہوتا۔ روشنی میں ہر شے اپنی صحیح صحیح حقیقت کے ساتھ اپنے مقام پر نظر آجاتی ہے۔ یہ تاریکی ہی ہے جس میں ہم رسّی کو سانپ اور سانپ کو بعض اوقات رسّی سمجھ لیتے ہیں۔ روشنی آجانے سے رسّی، رسّی اور سانپ سانپ کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے انسان پر اس قدر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں کہ نہ وہ خارجی کائنات کی کسی شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکتا تھا، نہ وہ اپنے مقام سے آگاہ تھا۔ یہ تاریکیاں کیا تھیں؟ قلب اور دماغ کی تاریکیاں، فکر و نظر کی تاریکیاں۔ یعنی جہالت اور توہم پرستی کی تاریکیاں۔ استبداد

تاریکیوں میں گھرا ہوا انسان

اور غلوِ عقیدت کی تاریکیاں۔ مختصراً یہ کہ اپنے مقام سے بیگانگی کی تاریکیاں — اور حقیقت یہ ہے کہ تمام تاریکیوں کا سرچشمہ اور منبع یہی تاریکی تھی۔ باقی سب تاریکیاں اسی کی پیداوار تھیں۔ اگر انسان پر اس کا صحیح مقام روشن ہو جائے تو یہ تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں — لہٰذا سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کا صحیح مقام کیا بتایا ہے؟ اگر ہم اس سوال کے جواب کی تفصیل میں جانا چاہیں تو اس کے لئے سارے کا سارا قرآن سامنے لانا پڑے گا۔ اس کے لئے بڑا وقت چاہیے۔ لہٰذا میں اس تھوڑے سے وقت میں اس سوال کے صرف چند ایک گوشے آپ کے سامنے لاؤں گا۔ وما توفیقی

الا باللہ العلی العظیم ۔

قرآن سے پہلے انسان کی حالت

لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ نزولِ قرآن سے پہلے انسان کن تاریکیوں میں ڈوبا ہوا اور کن پستیوں میں گرا ہوا تھا۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے مثنوی اسرار و رموز کے چند اشعار میں نہایت حسن و ایجاز سے بے نقاب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

بود انساں در جہاں انساں پرست ❊ ناکس و ناسودمند و زیردست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش ❊ بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر ❊ بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت ❊ باجے از کشتِ خراب او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش ❊ بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد ❊ خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

یہ تھی انسان کی کیفیت نزولِ قرآن کے وقت — انسان، انسان کی پرستش کرتا تھا۔ ان کی غلامی کا جوا اس کی گردن میں پڑا تھا۔ کہیں ملوکیت کا آہنی پنجہ اس کی رگِ جان کو دبائے ہوئے تھا۔ کہیں "روحانیت" کی غیر مرئی زنجیریں اس کے قلب و دماغ کو بری طرح جکڑے ہوئے تھیں۔ کہیں سرمایہ پرست کی ہوس خون آشامی اس کے لہو کا آخری قطرہ تک چوس رہی تھی۔ غرضیکہ ہزار شکاری تھے اور یہ ان میں گھرا ہوا، مظلوم و مقہور، کہیں ویسے ہی نخچیر — یہ تھی انسان کی کیفیت جب قرآن آیا۔

زنجیر شکن انقلاب

قرآن آیا اور اس نے آکر اعلان کیا کہ خدا کے اس عظیم دائمی انقلاب کے ظہورِ قدسی کا مقصد یہ ہے کہ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ - (۷/۱۵۷) یہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسان جکڑا ہوا چلا آرہا ہے۔ یہ اس کے سر سے ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ سے یہ کچلا جا رہا ہے۔ ان زنجیروں میں سب سے پہلی زنجیر اس کی توہم پرستی کی تھی جس کی رُو سے یہ خارجی کائنات کی ہر قوت سے ڈرتا تھا۔ بادل گرجا اور یہ سہم گیا۔ بجلی کڑکی اور یہ دبک کر بیٹھ گیا۔ بارش شروع ہوئی تو یہ کپکپا اُٹھا۔ پہاڑ سامنے آیا تو اس کی ہیبت سے لرز اٹھا۔ دریا میں موجیں اٹھیں تو اس کا کلیجہ بلیوں اچھلنے لگا۔ ان مہیب قوتوں کے خطرات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن میں ایک ہی طریق آسکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ ان قوتوں کو خدا تسلیم کر لیا جائے۔ ان کے سامنے جھکا جائے۔ ڈنڈوت بجا لایا جائے۔ ان کی پرستش کی جائے۔ ان کے حضور قربانیاں دے کر انہیں خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔ خارجی قوتوں (مظاہرِ فطرت) کے مقابلہ میں یہ تھا وہ مقام

تسخیرِ فطرت

جو انسان نے اپنے لئے تجویز کر رکھا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے اسے للکار کر کہا کہ تو ان سے ڈرتا ہے؟ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی

الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۔ (۴۵/۱۳)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اسے خدا نے تمہارے فائدے کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ اگر تم ذرا غور و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ ان کا مقام کیا ہے اور تمہارا مقام کیا۔ یہ سب خادم ہیں اور انسان انکا مخدوم۔ یہ سب ساجد ہیں اور انسان ان کا مسجود۔ یہ سب قوانین خداوندی کے تابع مجبور زندگی بسر کر رہی ہیں اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ۔ (۲/۳۱) جوں جوں تم ان قوانین کا علم حاصل کرتے جاؤ گے۔ یہ قوتیں تمہارے سامنے جھکتی جائیں گی۔ یہ تھی وہ حقیقت جس کے پیشِ نظر، روحِ ارضی نے (اقبالؒ کے الفاظ میں) آدم کا یہ کہہ کر استقبال کیا تھا کہ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں　　یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں!
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں　　تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

یہ تھا وہ انقلاب آفریں پیغام جو قرآن نے انسان کو دیا اور اسے بتایا کہ

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر　　نوری حضوری تیرے سپاہی

کائنات اور اس کی تمام قوتیں۔ ارض و سما اور ان کی سب نیرنگیاں —— (لَكُمْ) تمہارے لئے ہیں۔ تم ان کے لئے نہیں ہو۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

ہر بات قانون کے مطابق

اور پھر یہ بھی سمجھ لو کہ یہ قوانین جن کے مطابق یہ عظیم و مہیب قوتیں مصروفِ عمل ہیں، اٹل ہیں، غیر متبدل ہیں۔ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا اس لئے تمہیں اس کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ نہ معلوم کس وقت یہ قانون بدل جائے اور یہ قوتیں میرے قابو سے نکل جائیں۔ یہاں ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ قانون کے مطابق ہوتی رہے گی۔ اور ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہ جو آج "عزیزانِ من! زمین سے ابھر کر چاند پر کمندیں ڈالی جا رہی ہیں اور مریخ کو زیرپا لانے کے منصوبے بن رہے ہیں، تو یہ کچھ اسی یقینِ محکم کے تابع ہو رہا ہے جسے قرآن نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے انسان کو یہ کہہ کر دلایا تھا کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی، لہٰذا، تم نہایت اطمینان اور کامل اعتماد کے ساتھ ان مظاہر فطرت کو مسخر کرتے جاؤ۔

قرآن کا آئینہ

یہ تھا وہ آئینہ جس میں قرآن نے، انسان کو اس کی حقیقی شکل دکھائی۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں، مثنوی اسرار و رموز کی ایک حکایت میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک شیر کا بچہ، پیدا ہونے کے ساتھ ہی کسی حادثے کی وجہ سے ماں باپ سے الگ ہو کر، جنگل میں بھیڑوں کے گلے میں مل گیا۔ وہ وہیں بڑھا پھولا، شکل تو اس کی شیر کی سی رہی لیکن عادات و خصائل سب بھیڑوں کی پیدا ہو گئیں۔ ایک دن، ایک شیر نے بھیڑوں کے اس گلے پر حملہ کر دیا۔ تو وہ کیا دیکھتا ہے

اور جہاں اس کی دہشت سے بھیڑیں بدحواس بھاگی جا رہی ہیں، ان میں ایک شیر بھی اسی طرح، ڈرے سہمے جھاڑیوں کے

بھیڑوں میں پلا ہوا شیر

نیچے چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ حیران تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ شیر اور بھیڑوں کی طرح بزدل! تھوڑے سے توقف کے بعد بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے بھیڑوں کا خیال چھوڑ دیا اور سیدھا اُس "میمنا شیر" کی طرف لپک کر آیا۔ اُسے جھاڑی میں جا دبوچا اور کان سے پکڑ کر اپنے ساتھ ایک ایسے شفاف چشمے کے کنارے لے آیا جس میں اس کا عکس صاف دکھائی دے۔ اس نے اس شیر کو اپنے برابر کھڑا کیا اور اس کا سر جھکا کر اسے چشمے میں اس کا عکس دکھایا۔ شیر نے جب اپنا عکس دیکھا تو اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا۔ اور ایک ہی ثانیہ میں بھیڑ سے شیر بن گیا۔

قرآن نے اپنے آئینے میں انسان کو اس کا صحیح عکس دکھایا تو وہ ایک ہی جست میں مسجودِ ملائک اور مخدومِ کائنات بن گیا۔

کہیے، برادرانِ عزیز! کیا یہ واقعہ ایک عظیم تھا یا نہیں کہ انسان اس پر جشنِ مسرت منائے؟

اب آگے بڑھیے۔ انسان کے لئے، مجبور محض اشیائے کائنات کو مسخر کر لینا پھر بھی آسان تھا۔ مشکل مرحلہ وہ تھا

۲ کسی کی محکومی نہیں

جہاں، انسان دوسرے انسان کے استبداد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ زنجیرِ انسانی حکمرانی کی تھی اور اس خوئے غلامی میں اسے اس قدر پختہ کر دیا گیا تھا کہ وہ انسانوں کی محکومیت کو اپنی فطرت کا تقاضا اور اُن کا پیدائشی حق سمجھنے لگ گیا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ
كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ
تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ - (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ خدا نے اُسے ضابطۂ کتاب، حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ دی ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے، میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تمہیں ربانی بننا چاہیئے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کتابِ خداوندی کی اطاعت کرو جسے تم پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کے اس ایک اعلان نے کس طرح ہر قسم کی انسانی حکمرانی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اس نے انسان کو ہر قسم کی انسانی غلامی سے نجات دلا کر اسے ایک خدا کی محکومیت کی دعوت دی۔ اور وہ محکومیت بھی قانون کی، جو خدا کی کتاب میں دیا گیا ہے اور جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی ساری تعلیم اسی بنیادی نقطہ کی شرح ہے کہ اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۷/۳) اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کرو۔ ان کے علاوہ کسی انسان کی اطاعت مت کرو۔ اور یہی ہے وہ عظیم حقیقت جسے قرآن کریم کی اُس آیت میں دہرایا گیا ہے جسے میں نے

سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ یعنی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱/۵۶) انسان کا تخلیقی مقصد یہ ہے کہ وہ صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر اس نے اس کے علاوہ کسی اور کی محکومی اختیار کرلی تو یہ اس کی تخلیق کے مقصد کے خلاف ہوگا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے اس ایک اعلان سے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

انسان کو کس طرح اس ذلت دلپستی سے نکال کر جو اُسے اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے سامنے جھکنے سے ننگ انسانیت بنا دیتی تھی، شرفِ آدمیت کے بلند ترین مقام پر لا کھڑا کیا ۔۔۔ ایک خدا کی اطاعت، اور وہ بھی قانون کی رُو سے اس کے لئے کس طرح دنیا بھر کی سرفرازیوں کا موجب بن گئی اور اسے یہ حقیقت سمجھا گئی کہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ تو تھا ملوکیت کا استبداد جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے لیکن یہ جھکنا انسان کے بدن کا تھا۔ وہ چاہتا تو اپنے قلب و دماغ کو اس سے آزاد رکھ سکتا تھا لیکن اس سے آگے انسان

مذہبی پیشوائیت کی محکومی

کے جھکنے کا وہ مقام آتا ہے جس میں اس کا قلب و دماغ محکومیت، اور بڑی شدید محکومیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ محکومیت تھی مذہبی پیشوائیت کی جو دوسرے انسانوں سے اپنی خدائی منواتی تھی۔ خواہ یہ "رضواں فروش" شریعت کے علمبرداروں کی طرف سے ہو اور خواہ "جنت بداماں" طریقت کے مدعیوں کی طرف سے۔ قرآن نے غلط عقیدت مندی کے عنکبوتی جالوں میں جکڑے ہوئے انسان کو آواز دی اور اس سے کہا کہ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ یہ جو مقدس نقابوں کی اوٹ میں خدا کے نمائندے بن کر تمہارے سامنے آتے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (۹/۳۴) پیرانِ طریقت ہوں یا علمائے شریعت، ان کا سارا مسئلہ معاشی ہے لیکن یہ اسے مذہب کے نقاب میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا یہ عالم ہے کہ خود کچھ نہیں کماتے اور دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کی راہ بتاتے ہیں لیکن درحقیقت انہیں خدا کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں۔ ان کا وجود اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتا ہے۔ یہ خدا سے ورے، خود خدا بن بیٹھے ہیں۔ (أَنْدَادًا مِّن دُونِ اللَّهِ) اس لئے خدا تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ راستے ہی میں روک لیتے ہیں۔ یہ رہبر نہیں، رہزن ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر لوگ "خدا تک پہنچ جائیں" (یعنی اس کی کتاب کو اپنا راہنما بنالیں) تو ان "خدا کے نمائندوں" کا وجود ہی ختم ہوجائے۔ ان کی خدائی کی حقیقت تو اتنی ہے کہ

ایں خدا نا سجدہ اش کردی خطا است
چوں بکے اندر قیام آئی فنا ست

مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی کا دائرہ زندہ انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ ان کی حکومت ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔۔۔ بلکہ مرنے کے بعد ان کی گرفتیں اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔ "روحانیت" کی دنیا میں زندہ انسانوں پر مُردے حکومت کرتے ہیں۔ یہاں مُردہ بدست زندہ نہیں ہوتا۔ زندہ بدستِ مردہ ہوتا ہے۔ زندہ انسان، ان

زندہ بدست مردہ

مُردوں کی بے پناہ قوتوں کے خیال سے کانپتا ہے۔ ڈرتا ہے۔ ان کے حضور منتیں مانتا اور نذرانے گذارتا ہے۔ اگر اس کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی ایسا خیال گذر جائے جسے زیرِ زمین "حضرت صاحب" کی شانِ اقدس میں گستاخی پر محمول کیا جا سکے تو اس پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور جب تک ان سے معافی مانگ کر انہیں راضی نہیں کر لیتا (اور یہ معافی، ان کے مجاوروں کے حضور نذرانے گذارے بغیر مل نہیں سکتی)، اس وقت تک وہ اطمینان کا سانس نہیں لیتا۔ یہ گذرے ہوئے احبار و رہبان، بزرگوں کے مزاروں کی شکل میں بھی زندہ و پائندہ ہوتے ہیں، اور ائمہ سلف کے اقوال و افعال کی صورت میں بھی ہر وقت اعصاب پر سوار۔ ان دونوں کی غلامی کا قلادہ، زندہ انسانوں کی گردن میں پڑا رہتا ہے (اس سے "تقلید" کے معنی آپ کی سمجھ میں آ جائیں گے۔ قلادہ اس پٹے یا رسے کو کہتے ہیں جو جانور کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اس کا مالک جدھر جی چاہے اُسے اس سے پکڑ کر کھینچتا پھرے اور وہ خاموش گردن جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہے)۔ ان کی "ہمہ وقت موجودگی" کا یہ عالم ہے کہ خدا کی کتاب کا ارشاد کچھ ہو، آپ کی عقل و بصیرت کچھ کہے۔ جونہی آپ نے ان کی کسی بات کے خلاف کچھ کہا، ان میں سے کوئی نہ کوئی مردہ آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ اب آپ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔۔۔

یہ تھی غلامی کی وہ شدید ترین اور بد ترین شکل جس میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ قرآن کریم نے ایک انقلابی آواز سے غلامی کی ان زنجیروں کو تارِ عنکبوت کی طرح جھٹک کر الگ کر دیا۔ اس نے کہا کہ ان گذرے ہوئے اسلاف کی پوزیشن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت پر دنیا سے چلے گئے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے اور وہی اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ جو کچھ تم کرو گے اس کی ذمہ داری تم پر عاید ہو گی۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۲/۱۳۴)۔ تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ ان میں سے جو لوگ صاحبِ ایمان تھے، ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ إِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ (۵۹/۱۰) وہ ہمارے بھائی تھے جو ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نہ ان کا کوئی قول تمہارے لئے سند ہو سکتا ہے نہ ان کا کوئی عمل تمہارے لئے حجت۔ سند اور حجت خدا کی کتاب ہے اور بس۔ اسلاف پرستی

گدّی میں آنکھیں

سے انسان کا ماضی تو روشن ہوتا ہے لیکن مستقبل تاریک۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اہلِ جہنم کے منہ پیچھے کی طرف مڑے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں پیشانی کے بجائے اُن کی گدّی میں لگی ہوں گی۔ (يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ)۔ اس کی وجہ یہ کہ (خود ان کے الفاظ میں) وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (۳۳/۶۷)۔ "ہم نے اپنے بڑے بزرگوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں غلط راستے پر ڈال دیا۔" انہی کے متعلق قرآن دوسری

جگہ (سورۃ یٰسین میں) کہتا ہے کہ ان کی گردنوں میں اس قسم کے طوق پڑ جاتے ہیں جن سے وہ راستہ دیکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ ان کی نگہِ بصیرت سلب ہو جاتی ہے۔ ان کے آگے اور پیچھے اندھی عقیدت اور توہم پرستی کی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ (۳۶/۹) سورۃ بقرہ میں قرآن نے مقلدین کو بھیڑوں کے گلے اور ان کے مقتداؤں کو گڈریئے سے تشبیہہ دی ہے۔ اور کہا ہے کہ گڈریا کچھ آوازیں نکالتا ہے، بے الفاظ اور کچھ

بھیڑوں کا گلہ

الفاظ بولتا ہے، بے معنی۔ اور یہ بھیڑیں ان آوازوں پر اس طرح لگی ہوتی ہیں کہ یہ جھکائے ان کے مطابق اِدھر اُدھر چلتی رہتی ہیں۔ نہ گڈریئے کو معلوم ہوتا ہے کہ ان آوازوں کا کیا مطلب اور ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ اور نہ ہی ان بھیڑوں کو اس سے کچھ واسطہ۔ گڈریئے یہ آوازیں اور الفاظ اپنے بڑوں سے اسی طرح سنکر یاد کر رکھے ہوتے ہیں۔ اور بھیڑیں ان کے مطابق، اپنی عادتِ مستمرہ کی رو سے غیر شعوری طور پر ان کا اتباع کئے چلی جاتی ہیں۔ (۲/۱۷۰-۱۷۱)

اس قسم کی ذہنی غلامی سے انسان کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو کسی صبح جناح باغ میں جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک تیتر والا خالی پنجرہ لئے آگے آگے جا رہا ہے اور تیتر اس کے پیچھے پیچھے

قفس کا پرندہ

بھاگتا چلا آ رہا ہے۔ آزاد پرندے اُسے آوازیں دیتے ہیں کہ تمہارا مقام اس طرف ہے۔ اُدھر کہاں جا رہے ہو۔ وہ ان آوازوں کو سنتا ہے — اور بال و پر رکھنے کے باوجود، اور تیزی سے قفس کی طرف لپکتا ہے۔ اگر اس کا دروازہ بند پاتا ہے تو اُسے چونچ مار مار کر کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب تک پنجرے کے اندر بند نہیں ہو جاتا اسے چین نہیں پڑتا۔ آزاد فضاؤں میں اُڑنے والے مرغانِ سحر جب اس کی اس حرکت پر طعنہ زن ہوتے ہیں تو وہ نہایت سکون و اطمینان سے انہیں کہتا ہے کہ تم قفس کی زندگی کی لذتوں کو کیا جانو —

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

تقلید کی زندگی بڑی سہل انگاری اور تن آسانی کی ہوتی ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کی علمی کاوش کرنی پڑتی ہے، نہ فکری کاوش۔ جو ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جاؤ اور یہ وظیفہ پڑھتے رہو کہ کل خیر فی اتباع من السلف۔ ہر قسم کی نیکیاں اور بھلائیاں سلف کے اتباع میں ہیں۔ اس سے جھوٹا اطمینان تو ضرور میسر آ جاتا ہے لیکن انسان اپنے مقام سے گر کر خالص حیوانات کی سطح پر آ جاتا ہے۔ وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے اسلاف پرستی کی غلامی سے یہ کہہ کر نجات دلائی کہ وہ اپنے وقت پر دنیا سے چلے گئے۔ تم سے ان کی بابت کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔ تم سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر اپنے لئے کیا فیصلے کئے تھے۔

یہ تو رہا ائمہ سلف کا معاملہ۔ جہاں تک مُردوں کی غلامی کا تعلق تھا اس نے زندہ انسانوں سے کہا کہ

مُردوں کی حالت

ذرا سوچو کہ جن ہستیوں کو تم اپنا "خدا" سمجھ رہے ہو، ان کی کیفیت یہ ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار

کو سن نہیں سکتے۔ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ (۳۵/۱۴) اور اگر وہ بفرضِ محال تمہاری پکار سن بھی لیں تو اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ان کے عدمِ شعور کی تو یہ کیفیت ہے کہ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱) انہیں خود اپنے متعلق بھی علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ لہٰذا ان سے ڈرنا کیوں اور ان سے مرادیں کیوں وابستہ کرنا۔ یہ شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے کہ زندہ انسان مردوں سے ڈرتا رہے اور انہیں اپنا حاجت روا تسلیم کرے۔

غور کیجئے کہ قرآن نے اس انقلابی اعلان سے انسان کو کس کس نوعیت کی ذلتوں سے بچا لیا؟ سوچئے کہ کیا ایسا انقلاب اس قابل نہیں کہ اس پر انسان جشنِ مسرت منائے؟

روٹی کی محتاجی

انسان کو انسان کے سامنے جھکانے کا ایک اور مؤثر حربہ یہ تھا کہ اُسے روٹی کا محتاج بنا دیا جائے اور اس طرح اُسے بھوکا رکھ کر، اس سے اپنا ہر حکم منوا لیا جائے۔ آپ نے سرکس کے شیر کو دیکھا ہوگا اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ ایک رِنگ ماسٹر تو کیا، وہ جنگلے کے اندر کے تمام آدمیوں کو چبا سکتا ہے لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ اس کے باوجود، رنگ ماسٹر کے ہنٹر کے سامنے کس طرح جھکتا اور دھاڑتا، ہر وہ حرکت کرتا ہے جس کا اسے اشارہ کیا جاتا ہے؟ یہ کیوں؟ محض بھوک کی وجہ سے۔ یہی حربہ صاحبِ قوت انسانوں نے، دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنانے کے لئے اختیار کیا۔ انہوں نے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح دوسروں کو محتاج بنا کر، ان سے اپنا ہر حکم منوانے لگے۔ اس طرح انسان، شرفِ آدمیت سے عاری ہو کر، بھوکے حیوانات کی سطح پر آ پہنچا۔

قرآن آیا اور اس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ رزق کے معاملہ میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) ہم تمام افراد کے رزق کے ذمہ دار ہیں — اُن کے بھی اور ان کی اولاد کے بھی۔ ہم ایسا نظامِ معاشرہ قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کی ملکیت میں رہنے کے بجائے، تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ بنیں۔ اور کوئی کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو۔ غور فرمائیے کہ اس اعلان سے انسان کو کس قدر جانگسل ذلت اور روح فرسا محکومیت سے نجات مل گئی۔ سوچئے برادرانِ گرامی! کہ تاریخِ انسانیت کا کیا یہ ایسا انقلاب نہیں جس پر نوعِ انسان مسرت کے جشن منائے۔!

یہ تھی عزیزانِ من! نزولِ قرآن سے پہلے انسانوں کی حالت — وہ حالت جس میں ہر انسان، اپنے سے زیادہ قوت یا عقلِ فریب کار رکھنے والے انسان کے سامنے جھکتا تھا۔ اور انسان کا انسان کے سامنے جھکنا، شرفِ انسانیت کی انتہائی ذلت ہے۔ اس لئے کہ

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

اس سے تو انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ قرآن نے انسانوں کے سامنے جھکنے اور جھکانے کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ یہ تھے وہ تصورات جو قرآن نے دیئے اور اس طرح انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کیا اور اس سے

کہہ دیا کہ اگر تم ان دروازوں کو بند رکھو گے تو تمہیں ایسا معاشرہ میسر آجائے گا جس میں کیفیت یہ ہوگی کہ۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ جس میں تمہیں نہ کسی قسم کا خطرہ ہوگا نہ خوف و حزن۔ ہر طرح کا اطمینان اور ہر قسم کی سلامتی۔ اور اس کے ساتھ ہی

فیصلہ کن حقیقت

یہ بھی کہہ دیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ کوئی شاعری نہیں۔ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶/۱۴-۱۳) یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ یونہی پا در ہوا بات نہیں۔ اس کے بعد کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم نے یہ زنجیریں کیوں توڑی ہیں۔ بتائیے راستے میں حائل شدہ پتھروں کو کیوں ہٹایا ہے۔ یہ سامنے کے پھاٹک کیوں کھول دیئے ہیں۔ اسلئے کہ ہر انسانی بچے کو زندگی کی دوڑ میں مسابقت کے لئے ایک جیسا میدان ملے۔ نہ کسی کو بے جا رعایت ملے، نہ کسی کے راستے میں کوئی رکاوٹ آئے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ جس کا جی چاہے اپنی محنت سے آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے فقدانِ عمل سے پیچھے رہ جائے۔ یہاں ہر فیصلہ انسان کے جوہرِ ذاتی اور عملِ پیہم کے مطابق ہو۔ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴/۳۸) یہ نہ ہو کہ بڑے باپ کا بیٹا، پیدا ہوتے ہی سونے کا چمچہ منہ میں لئے ہو۔ اور غریب کا بیٹا ابتدائی تعلیم تک بھی حاصل نہ کر سکے کیونکہ اس کے باپ کے پاس اسے اسکول میں داخل کرانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ یہ پیدائشی تفریق، برہمن کی خودساختہ زنجیریں تھیں جن میں وہ شودر کے بچوں کو جکڑے رکھتا تھا۔ قرآن نے انسان کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ قرآن کیا ہے؟ موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے۔

یہ تھا برادرانِ عزیز! وہ مقصد جمیل و جلیل جس کے لئے نوعِ انسان کو قرآن دیا گیا تھا۔ اور اس سے کہا گیا تھا کہ ایسے منشورِ حریت و آزادی کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یعنی انسان کو یہ بتانے کے لئے کہ

ع ستارہ سے آگے مقام ہے تیرا

بلکہ — ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا۔ انسان اَقْطَارُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے بھی آگے جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے وہ قوت حاصل ہو جائے جو وحی کی راہ نمائی عطا کرتی ہے۔ (۵۵/۳۳)

یہ تھا، مقصد قرآن کی تعلیم کا۔ اس نے ایک ایسا آئینہ دیا جس میں انسان کو، اس کے صحیح خدوخال نکھر کر نظر آ سکتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے، اُس شیر بیشہ کی طرح، ساتھ کھڑے ہو کر انسان کو، قرآن کے آئینے میں اس کی اصلی شکل سے روشناس کرایا اور اس طرح مردانِ خود آگاہ کی ایک جماعت وجود میں آگئی۔ اس جماعت نے ایک طرف قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ کر مظلوم انسانیت کو استبداد و ملوکیت سے نجات دلائی، تو دوسری طرف ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی کر کے مذہبی پیشوائیت کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے یہودیوں کو خارج البلد کر کے سرمایہ پرستی کی بساط لپیٹ دی اور شام کی خانقاہوں میں علم و بصیرت کے دیئے جلا کر، انسان کے قلب و نظر کی تاریکیوں کو روشنی سے بدل دیا۔ اس طرح اس جماعت کی حق آگاہی اور خودشناسی نے انسان کو وہ مقام عطا کر دیا جس کے حصول کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا — لیکن — اور یہ لیکن، کرب و درد کی ایک دنیائے پرسوز اپنے اندر لئے ہوتے ہے۔ اس لیکن کو برادرانِ عزیز! میرے الفاظ میں نہیں، خود قرآن

قرآن نے کیا کیا

اسکے بعد کیا ہوا

کے الفاظ میں سنیئے۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا — انہیں اس شخص کی عبرت انگیز داستان سناؤ جسے ہم نے اپنے قوانین عطا کئے تھے کہ وہ ان کی روشنی میں مقامِ انسانیت حاصل کرے اس نے ایسا کیا لیکن اس کے بعد فَانسَلَخَ مِنْهَا۔ وہ انہیں یوں چھوڑ گیا جیسے سانپ کینچلی اتار کر آگے نکل جاتا ہے اور اس پر اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ۔ شیطان تو اس کی گھات میں پہلے سے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے جا دبوچا اور دوسرے راستے پر ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ۔ ہم چاہتے تھے کہ اس قرآن کے ذریعے اسے آسمان کی بلندیوں پر لے جائیں لیکن یہ بدنصیب زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹ کر رہ گیا اور زندگی کے بلند مقاصد کی جگہ اپنی خواہشات ہی کے پیچھے لگ گیا۔ اس ہوس پرستی سے اس کی حالت یہ ہوگئی کہ ہر وقت کتے کی طرح زبان لٹکائے پھر رہا ہے۔ ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی ہے۔ یعنی وہ ان کا زبان سے انکار نہیں کرتی۔ اس کا تو دعویٰ کرتی رہتی ہے کہ اس کا ان قوانین پر ایمان ہے لیکن عملاً ان کی تکذیب کرتی ہے۔ یہ ہے قرآن کے الفاظ میں ہماری درد انگیز اور عبرت آمیز داستان! اس کے بعد کہا — فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔ (۷/۱۷۵-۱۷۶) انہیں ان کی داستان سناؤ۔ شاید اسی سے ان میں غور و فکر کی صلاحیت بیدار ہو جائے اور یہ سوچیں کہ ہم کس آسمان کے ٹوٹتے ہوئے تارے ہیں۔ ہم کیا تھے۔ اور اب کیا بن کر رہ گئے ہیں!

یہ کیسے ہوا

یہ کیسے ہوا؟ اس کا جواب خود اس آیت میں موجود ہے۔ اس قوم نے قوانینِ خداوندی کو اس طرح چھوڑا کہ ان کا کوئی نشان تک ان کی زندگی میں باقی نہ رہا۔ اور یہی وہ شکایت ہے جو حضور نبی اکرمؐ بجناب باری تعالیٰ ان الفاظ میں کریں گے کہ وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا۔ (۲۵/۳۰)۔ قرآن کو چھوڑا تو دین مذہب میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، اسے علامہ اقبالؒ نے بڑے لطیف اور حسین طنز کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ مذہب کے علمبردار ملّا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تیرا دعویٰ ہے کہ تو خدا تک پہنچا ہوا ہے۔ اس کا تو مجھے علم نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تو مقامِ آدمیت سے قطعاً ناآشنا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ

بآدمے نرسیدی - خدا چہ می جوئی!

جو مقامِ آدم سے ناآشنا ہے وہ خدا شناس کیسے ہو سکتا ہے — جو اپنے مقام سے واقف نہیں وہ خدا کے مقام سے کیسے واقف ہو سکتا ہے۔ جو اپنے تصورات کے تراشیدہ بتوں کے سامنے جھکتا ہے جو اپنے توہمات کے پیدا کردہ خداؤں کے سامنے جھکتا ہے۔ جو اپنے جیسے انسانوں کے سامنے جھکتا ہے۔ وہ خدا تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟

——— (٠) ———

کہا جائے گا کہ ہم تو مختلف نوعیتوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن یورپ کی قوموں نے کائنات کی قوتوں کو مسخر کر لیا ہے۔ وہ تو آزادی کی نعمت سے سرفراز ہیں لیکن یہ خیال انتہائی سطح بینی پر مبنی ہے۔

مغرب کا انسان

انسان کی آزادی اور غلامی ماپنے کا معیار، خارجی قوتوں پر کنٹرول نہیں۔ اس کا معیار وہ فلسفۂ زندگی یا تصورِ حیات ہے جسے کسی قوم نے اختیار کر رکھا ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ یورپ کے محققین نے انسان کے متعلق جو نظریات پیش کئے ہیں ان کی رُو سے اس کی پوزیشن کیا سامنے آتی ہے ایک ایسی مجبور و مقہور مخلوق جسے اپنے کسی عمل اور ارادہ پر کوئی اختیار نہیں۔ (مثلاً)

(۱) اُن کے علمائے علم الحیات (BIOLOGISTS) کی تحقیق نے یہ بتایا ہے کہ انسانی بچہ اپنی سیرت و کردار کے تمام بنیادی خطوط اپنے باپ کے نطفہ سے متوارث لیتا ہے اور انہیں مٹانے پر اس کا اُس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لہٰذا انسان پیدائش کے اعتبار سے مجبور ہے۔

(۲) محققینِ علم الانسان (ANTHROPOLOGISTS) آگے بڑھے اور دنیا کو یہ بتایا کہ عہدِ قدیم سے لیکر اس وقت تک انسان کی سینکڑوں نسلوں میں جو عقاید، تصورات، رسوم و مناسک متوارث چلے آ رہے ہیں ہر انسانی بچہ ان کا مرکب ہوتا ہے اور اسے اس کی قدرت ہی حاصل نہیں ہوتی کہ ان اثرات کو محو کر سکے۔

(۳) علمائے عمرانیات (SOCIOLOGISTS) آئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ انسانی بچہ جس ماحول میں سانس لیتا ہے اس کا کیرکٹر اس کے گہرے اور انمٹ نقوش کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسان اپنے ابتدائی ماحول کی زنجیروں سے آزاد ہو نہیں سکتا۔

(۴) علمائے نفسیات (PSYCHOLOGISTS) نے مسکرا کر کہا کہ صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جس چیز کو آپ انسان کا اختیار و ارادہ اور فکر و شعور بتا رہے ہیں، وہ کوئی شے ہی نہیں۔ انسان کی ہر فکر اور ارادہ کو ایک اور ہی قوت کنٹرول کر رہی ہے جسے اس کا نفس لاشعور (UN-CONSCIOUS MIND) کہا جاتا ہے یہ وہ جن ہے جو کسی کے قابو میں ہی نہیں آ سکتا۔ نہ اس کے بنانے میں کسی کا اختیار ہے، نہ اس کی خلاف ورزی کا کسی میں یارا۔ انسان کا ہر عمل اور ارادہ اس کے نفس لاشعور کی نمود کا نام ہے۔ لہٰذا جسے آپ انسان کا با اختیار شعور کہتے ہیں وہ فریبِ تخیل کے سوا کچھ نہیں۔

(۵) علمائے اقتصادیات (ECONOMISTS) آئے اور انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان اپنے زمانے کے معاشی نظام کی پیداوار ہوتا ہے جس قسم کا یہ نظام اسی قسم کا اس دور کا انسان۔ جب پوچھا گیا کہ یہ معاشی نظام کس کا قائم کردہ ہوتا ہے تو جواب ملا کہ یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کا پیدا کردہ ہوتا ہے جس کے بدلنے پر انسان قطعاً قادر نہیں۔

آپ سوچئے عزیزانِ من! کہ انسان کے متعلق جو تصور ان مفکرین و محققین کا پیش کردہ ہے اس کی رُو سے انسان کو ذرا سا بھی آزاد قرار دیا جا سکتا ہے! قوائے فطرت کی بالادستی یا غیر قوموں کی محکومی تو پھر بھی ایسی غلامی ہے جس کی زنجیریں توڑنے کی خواہش ہر انسان کے دل میں موجزن رہتی ہے لیکن جب انسان اپنے متعلق خود اس قسم کا تصور اپنے ذہن میں راسخ کر لے تو وہ ان زنجیروں سے کبھی بھی رستگاری حاصل کر سکتا ہے! لہٰذا ایشیا ہو یا

یورپ، افریقہ ہو یا امریکہ، آج حقیقی آزادی کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے ہوں سیار

اب بھی کچھ نہیں بگڑا

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری۔ اس غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے آج دنیا کے ہر انسان کو قرآن یہ پیغام دیتا ہے کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ اس قرآن کے ساتھ پھر سے متمسک ہو جاؤ یہ تمہیں زندگی کے اس راستے پر ڈال دے گا جو سیدھا منزلِ انسانیت تک پہنچاتا ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ۔ اس سے تمہیں پھر وہی شرف و مجد حاصل ہو جائے گا جو ایک دفعہ حاصل ہوا تھا۔ وَ سَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ۔ (۴۳) خدا کا قانونِ مکافات بہت جلد تم سے پوچھے گا کہ تم نے ایسا کیا تھا یا نہیں یعنی اس کے نتائج مرتب ہونے میں کچھ دیر نہیں لگے گی۔ یہ تو ایسا شجرِ طیب ہے کہ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ (۱۴)۔ جو ہر زمانے میں اپنا پھل بدستور دیئے چلا جاتا ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں محتاج
بہار ہو کہ خزاں — لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

دیر تو تمہاری طرف سے ہی ہے۔ اس کی شاخیں تمہاری طرف جھکی ہوئی ہیں۔ ذرا ہاتھ بڑھاؤ اور پھل تمہاری جھولی میں ہوگا۔ قرآن میں ہر وقت اس کی صلاحیت موجود ہے کہ یہ انسان کو اس کا صحیح مقام عطا کر دے۔

گر زمینی آسماں سازد ترا	آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
خند باشی، استوارت می کند	پختہ مثلِ کوہسارت می کند
نوعِ انساں را پیامِ آخریں	حاملِ اُو رحمۃ للعالمین

لہٰذا سوچئے برادرانِ عزیز! کہ انسان کو اگر اس قسم کا نسخہ ہاتھ آجائے جس سے اُسے کائنات میں یہ مقام حاصل ہو جائے تو اس کے لئے یہ تقریب جشنِ مسرت منانے کی ہے یا نہیں؟ آج قرآن کی عظمت و اہمیت ہماری نگاہوں کے سامنے اس لئے نہیں آتی کہ ہم مقامِ آدمیت کی عظمت و رفعت ہی سے ناآشنا ہو چکے ہیں۔ اسی لئے یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم عید کیوں مناتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے جو اقبالؒ نے کبھی بایں درد و کرب کہا تھا کہ

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے؟
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے!

ہماری عید

یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ لیکن ہے یہ آج بھی اسی طرح حقیقت۔ بلکہ آج ہماری نکبت و زبوں حالی اُس زمانے سے بھی زیادہ شدید ہے۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ اب ہلالِ عید ہماری کس طرح ہنسی اڑاتا ہے، تو چار دن کے بعد اپنے اجتماعِ عید پر طائرانہ نگاہ ڈال لیجئے گا۔ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی۔ کچھ دور کی بات نہیں کہ عید کے اجتماع میں کم از کم ہر فرد نئے کپڑے پہن کر آتا تھا۔ ہر بچے کو خوشنما لباس اور نیا جوتا مل جاتا تھا۔ اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ آپ اس اجتماع میں نوے فیصد افراد (اور بچوں) کو پرانے کپڑوں

میں ملبوس دیکھیں گے۔ بات یہ چھوٹی سی ہے لیکن آئینہ دار ہے ایک بہت بڑی حقیقت کی جب قوم کے افراد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی تک سے محروم ہو رہے ہوں۔ اسے کیا معلوم کہ مقامِ آدمیت کیا ہوتا ہے؟ وہ تو آسمان کی رفعتوں کا نام ہے اور یہاں زمین کی پستیاں بھی نصیب نہیں! غیر شعوری طور پر ہماری حالت یہ ہو چکی ہے کہ ہم عید کی نماز تو (رسماً و کرہاً) پڑھ آتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ دن کیسے کاٹیں۔ یہ کسی قوم کی قلبی کیفیت کے ماپنے کا بہت ادنیٰ معیار ہے لیکن میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جو قوم اس معیار پر پوری نہ اترے وہ کیا جانے کہ مقامِ آدمی کیا ہے؟ سوچئے کہ قرآن کو چھوڑ کر ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ آپ دلوں کو ٹٹول کر دیکھئے ہزار میں ایک دل بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں حقیقی مسرت کی کوئی کرن دکھائی دے — یہ کم نگاہی۔ یہ بے سوادی!

اور پھر اس سال (۱۹۷۲ء) کی عید! اسے عید کہتے ہوئے دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں جس قوم کی یہ حالت ہو کہ اس کی مملکت کا آدھا حصہ بالواسطہ ہندو کے قبضہ میں چلا گیا ہو جس کے ایک لاکھ کے قریب جیالے فرزند ان کی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہوں اور اس سلسلہ میں وہ کمینہ دشمن اس قسم کے حربے استعمال کر رہا ہو جس پر انسانی غیرت شرمائے اور حمیت ڈوب کر مر جائے جس کے بیس لاکھ کے قریب بستے رستے شریف شہری سال بھر سے خانماں خراب ایں سو راندہ و آں سو ماندہ انتہائی بےکسی اور بےبسی کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رہے ہوں جن کے زرد رُو بچے بھوک سے بلک رہے ہوں، جن کی برہنہ سر بیٹیاں چادروں کو ترس رہی ہوں۔ اگر ہلالِ عید اس قوم کی ہنسی نہیں اڑاتا تو اور کیا کرتا ہے! ان حالات میں عید خوشیاں منانے کا پیغام نہیں لائی، صفِ ماتم بچھانے کا سندیسہ لے کر آئی ہے۔

لیکن عزیزانِ من! اس میں ابدی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ہماری یہ نوحہ گری اور ماتم گساری پھر سے عید مسرت اور نوید بہجت میں بدل سکتی ہے۔ اگر ہم اپنے مروجہ غیر اسلامی تصورات کو چھوڑ کر قرآنی نظریات کو اپنا لیں۔

آئیے! ہم ایک دوسرے کو رسمی عید مبارک کہنے کے بجائے اس مقدس آرزو کو اپنے قلب کی گہرائیوں سے ابھاریں اور ان حسین الفاظ میں زبان پر لائیں کہ

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ؕ

وَالسَّلَامُ

(پرویز)

تصحیح - طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۶ کے نیچے آخری مصرعہ یوں ہے۔

آدمی کو بھی میسر نہیں حیواں ہونا

باسمہ تعالیٰ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو! کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

معرکۂ دین و وطن

جن عناصر نے تحریکِ پاکستان کی اِس شدّ و مد سے مخالفت کی تھی
وہی آج پھر کس جوش و خروش سے اس کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

اِس حقیقت کی داستانِ جگرخراش، اور مداوائے دلنواز۔

پرویز صاحب کا استقبالیہ

جس سے اُنہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن، منعقدہ نومبر ۱۹۷۲ء سے خطاب کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معرکۂ دین و وطن

رفیقانِ محترم و مہمانانِ مکرم سلام و رحمت!

سالِ گذشتہ، نومبر کی انہی تاریخوں میں، کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ اور اعلان ہوا تھا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے ہنگامی حالات نمودار ہونے کے باعث اسے عین وقت پر ملتوی کرنا پڑا۔ اس کنونشن میں میں نے جس استقبالیہ سے آپ کا خیر مقدم کرنا تھا۔ وہ اگرچہ بعد میں طلوعِ اسلام میں چھپ گیا تھا لیکن اسے بالمشافہ آپ احباب کی خدمت میں پیش نہیں کر سکا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ میں امسال انہی الفاظ میں آپ کا استقبال کروں جن میں نے کہا تھا کہ نجومیوں کے ہاں زہرہ اور مشتری ستاروں کو بڑا مبارک اور مسعود خیال کیا جاتا ہے۔ جب کبھی ایسا ہو کہ یہ دونوں ستارے یک جا جمع ہو جائیں تو وہ اسے قران السعدین سے تعبیر کرتے اور اس شگون کو بڑا بابرکت اور حاملِ یُمن و سعادت تصور کرتے ہیں۔ ہم نہ تو ستاروں کے سعد و نحس ہونے کے قائل ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے یک رنگ ہونے کو نشاط آہنگ تصور کر سکتے۔ جو خود مجبور و بے حیات اور مجبورِ اختیار ہوں وہ زندہ اور صاحبِ اختیار و ارادہ انسانوں کے مقدرات پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں؟ لیکن قران السعدین کا تو ہمیں بھی قائل ہونا پڑے گا۔ ہم وابستگانِ دامنِ قرآنی کے لئے سب سے بڑی گراں بہا سعادت و رحمت کی ساعت وہ ہے جب خدا کی یہ کتاب عظیم نوعِ انسان کو عطا کی گئی۔ اسی مبارک و مسعود تقریب کو عید الفطر کہا جاتا ہے اور ہم اسے جشنِ نزولِ قرآن کہہ کر منایا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے لئے وجہِ ہزار کیف اور باعثِ صد ہزار مسرت ہمارا یہ اجتماع ہے، جو قرآنی فکر کے فروغ اور رخشندگی کے لئے منعقد کیا جاتا ہے۔ اس دفعہ یہ دونوں بہجت زا اور مسرت افزا، تابندہ و درخشندہ تقاریب ایک ہی ماہ کے اندر، ہمارے لئے وجہِ نشاطِ روح اور باعثِ شادابیٔ قلب و نظر ہوتی ہیں۔ ایسے ہی کیف آمیز اور رقص آور تھے وہ لمحات جن سے مسحور ہو کر غالب جان نذر دینا بھول گیا تھا۔ آپ احباب کو خدا زندہ و پایندہ اور سرسبز و شاداب رکھے کہ آپ کی رفاقت میرے لئے زہرہ و مشتری کے قران السعدین سے ہزار گنا زیادہ موجبِ سعادت و باعثِ مسرت ہے۔ آپ جیسے ہی تو وہ محرم تھے جن کی تلاش میں اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

غزل سرایم و پیغامِ آشنا گویم ✤ بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم

رمیلانِ گرامی قدر! آج کے خطاب کے لئے میں نے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ آپ کے لئے حیرت کا موجب اور (شاید بعض احباب کے لئے) قدرے تشویش کا باعث نظر آئے۔

خطاب کا موضوع

لیکن جب آپ عنوان سے آگے بڑھ کر تفصیل تک پہنچیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں نہ کوئی بات باعثِ حیرت ہے، نہ کوئی چیز وجہِ تشویش۔ یہ ایک حقیقتِ نفس الامری کا احساس اور اظہار ہے جو وقت کے

تقاضوں کا فطری نتیجہ ہے میرے خطاب کا موضوع ہے۔

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو! کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

اس میں شبہ نہیں کہ میری ساری زندگی اسی آہِ سحری اور فغانِ نیم شبی کی داستانِ سوز و گداز ہے لیکن اس سفر میں بعض مقامات ایسے بھی آئے جہاں وقت کے تقاضوں نے للکار کر پکارا کہ

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

آج وقت کی ایسی ہی پکار ہے جسے میں نے آہ و فغانِ نیم شب کے لئے پیغامِ تازہ سے تعبیر کیا ہے۔

عزیزانِ من! جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے میری ساری زندگی قرآن کریم کے مطالعہ میں گذری ہے لیکن اس زندگی کا پہلا آدھا حصہ اس کتابِ عظیم کو بعض تقلیداً سمجھنے میں گذرا۔ اس کے بعد جب اسے خود اس کے اپنے بتائے ہوئے طریق کے مطابق غور و فکر اور علم و بصیرت کی رو سے سمجھنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آئی کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان کسی پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حیات ہے جو صرف اپنی آزاد مملکت میں متشکل ہو سکتا اور

اسلام نظامِ حیات ہے

قائم رہ سکتا ہے۔ اور دوسری بات یا یوں سمجھئے کہ اس شجرِ طیب کی دوسری شاخ یہ سمجھ میں آئی کہ جو لوگ اسلام کی اس حقیقت کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں وہ باقی دنیا سے الگ رنگ، نسل، زبان، وطن کے اختلافات کے علی الرغم ایک منفرد قوم بن جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ نسل یا وطن نہیں۔ ایمان کا اشتراک ہے۔

حسنِ اتفاق ہے کہ اسی اساسی حقیقت کا اعلان علامہ اقبالؒ نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کی صدارت کرتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں ان الفاظ میں فرمایا۔

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔۔۔۔۔۔ اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے۔۔۔۔ اس سے اسلام کو موقع ملے گا کہ اس پر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آ چکے ہیں ان سے مخلصی حاصل کرے اور اپنے شرعی قوانین، اپنی تعلیم اور اپنے تمدن کی تنظیم کر کے انہیں اپنی اصلی روح اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے قریب تر لا سکے۔

یہ میرے دل کی آواز اور میرے ایمان کے تقاضا کا اظہار تھا اس لئے میرا اس کی طرف لپک کر بڑھ جانا فطری امر تھا۔ اس وقت قوم نے اسے ایک فلسفی کا خیال اور شاعر کا خواب سمجھ کر درخورِ اعتنا قرار نہ دیا، لیکن اقبالؒ اپنی اس فکر کو مسلسل آگے بڑھاتے گئے۔ چنانچہ انہوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو قائد اعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا کہ

اس ملک میں شریعتِ اسلامی کے نفاذ اور فروغ کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں ایک یا ایک

سے زیادہ آزاد اسلامی مملکتیں قائم ہوں۔

ہندوستان میں اُس زمانے میں کانگریس کا بڑا زور تھا۔ اُس کی سیاست کی عمارت دو ستونوں پر استوار تھی۔ ایک

کانگریس کا نظریہ

یہ کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلم اور غیر مسلم اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک متحدہ قومیت کے افراد ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ آزاد ہندوستان کا نظامِ حکومت سیکولر ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ دونوں تصورات، اسلام کے اُن بنیادی نظریات کی یکسر ضد ہیں جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تحریکِ پاکستان اور کانگریس کی کشمکش، مروجہ اصطلاح میں سیاسی نوعیت کی نہیں تھی۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے وہ دو نظریاتِ زندگی کی جنگ تھی جو ایک دوسرے کی ضد تھے۔ وہ حق و باطل کی جنگ تھی۔ دین اور لادینی کی جنگ تھی۔ کفر اور اسلام کی جنگ تھی۔ یہ وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے اسے "معرکۂ دین و وطن" کہہ کر پکارا تھا اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر کہا تھا کہ

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن

مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ نزاع

اس معرکہ کی دینی حیثیت اُس وقت ابھر کر سامنے آئی جب ۱۹۳۸ء کے شروع میں دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے دہلی میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں

علامہ مرحوم اُس زمانے میں بسترِ مرگ پر پڑے تھے۔ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے مذہبی دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی زبان سے اس قسم کا خلافِ اسلام نعرہ سن کر تڑپ اٹھے۔ اور ان کے دلِ درد آلود کی یہ آہ آتشیں ان الفاظ میں ان کے لبوں تک آ گئی کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ!
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مولانا مدنی (مرحوم) بجائے اس کے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے مخالفت پر اتر آئے۔ اور اپنے دعویٰ کی تائید اور علامہ اقبالؒ کی تردید میں ایک بیان شائع کر دیا جو اسلام کی اساس قومیت کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا تھا۔ اس پر علامہ اقبالؒ نے (یوں کہئیے کہ اپنی زندگی کے آخری سانسوں میں) وہ معرکہ آرا بیان شائع کیا جو دین کے بنیادی تصورات سے متعلق ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ:

مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں "فرنگی نظریۂ وطنیت" کی اشاعت کی جائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ:

سوال زیرِ بحث، یہ ہے کہ کیا مسلمان اولاً اجتماعی اعتبار سے واحد و متحد و معرّف جماعت ہیں جس کی

اساس توحید اور ختم نبوت ہے یا کوئی ایسی جماعت ہیں جو نسل و ملک یا رنگ و زبان اور ان کے مقتضیات کے ماتحت اپنی ملی وحدت چھوڑ کر کسی اور نظام اور کانون کے ماتحت کوئی اور ہیئتِ اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں؟

اور آخر میں انہوں نے متنبہ کیا کہ

اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بر وقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگا۔ اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۔

آپ عزیزانِ من! علامہ اقبالؒ کے اس انتباہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کیونکہ یہی وہ سوال تھا جو حامیانِ تحریکِ پاکستان اور ان کے مقابلہ میں ہندوؤں اور ان کے ساتھ ان کے ہمنوا نیشنلسٹ مسلمانوں میں بنائے اختلاف و نزاع تھا اور یہی وہ مقام ہے جس پر ہم آج پھر آ چکے ہیں

یہ تھا وہ معرکۂ دین و وطن جس کے ایک سپاہی کی حیثیت سے طلوعِ اسلام وجود میں آیا۔ مولانا مدنی نے علامہ اقبالؒ کی زندگی میں تو ان کے بیان کے خلاف کچھ نہ کہا بلکہ یہ کہہ کر ایک طرح اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا کہ میں نے یہ کہا تھا کہ آج کل قومیں وطن کے اشتراک سے بنتی ہیں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام میں قومیت کا معیار اشتراکِ وطن ہے۔ لیکن ان کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد

علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد

ان کے بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کر دیا جس میں پھر تحدی سے کہا کہ میں نے درست کہا تھا اور اقبالؒ غلط تھا۔ طلوعِ اسلام نے اس پمفلٹ کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا کہ اگرچہ علامہ اقبالؒ آج ہم میں موجود نہیں لیکن مولانا صاحب کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ

اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی ❊ وہ مے وہ خُم، وہ صراحی وہ جام باقی ہے

"اور خم کدۂ اقبالؒ میں ایسے ایسے رند قدح خوار موجود ہیں جو ساقی کی چشمِ مست کے صدقے، شرابِ ہندی اور بادۂ حجازی میں ایک نگاہ میں تمیز کر کے بتا دیں۔ طلوعِ اسلام جسے پیامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قرآن کریم کی روشنی میں متحدہ قومیت کے نظریہ کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کے سامنے رکھ دے تاکہ وہ سعید روحیں جو تلاش حقیقت میں مضطرب بیتاب رہتی ہیں صحیح نتیجہ پہنچکر سامانِ تسکین حاصل کر لیں۔" اور اس کے بعد طلوعِ اسلام نے اس پمفلٹ کا ایسا جواب لکھا جس کی تردید کسی سے بن نہ پڑی۔

اس طرح طلوعِ اسلام کی طرف سے اس معرکہ کا آغاز ہوا۔ ایک طرف (اُس زمانے میں) یہ تنہا اللہ کا سپاہی تھا۔ اور دوسری طرف ہندو فوج در فوج، اور ان کے پیچھے پیچھے نیشنلسٹ مسلمانوں کا سیلاب بلا۔ ان میں متحدہ قومیت کے مدعی علمائے کرام، سرحد کے فدائی خدمتگار (سرخ پوش)، سندھ کے آزاد، پنجاب کے احرار، بنگال اور بہار کے انصار، سب شامل تھے۔ اس جنگ کی پوری تفصیل بیان کرنے کے لئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔ میں اس مختصر سے وقت میں صرف اتنا بتانے پر اکتفا کروں گا کہ اس محاذ کی طرف سے اسلامی نظریہ قومیت اور تصورِ مملکت کے خلاف کیا کچھ کہا اور لکھا گیا جس کا مقابلہ طلوعِ اسلام نے کیا۔ پہلے نظریہ قومیت کو لیجئے۔

مسٹر گاندھی، نہ صرف یہ کہ وہ ہندوؤں کی تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے راہ نما تھے، ان کی قوم نے انہیں مہاتما کا

نظریہ قومیت کے بنیادات

درجہ دے رکھا تھا۔ لہٰذا ہم اس باب میں ابتداء انہی کے عبارات سے کرتے ہیں۔ پاکستان ریزولیشن جس میں دو قومی نظریہ کو مسلمانوں کی الگ مملکت کی بنیاد قرار دیا گیا تھا، مارچ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا اور مسٹر گاندھی نے اپریل ۱۹۴۰ء میں ایک مبسوط مضمون میں اس کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیا۔ انہوں نے کہا:-

> دو قوموں کا نظریہ بالکل باطل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو خود دوسرے مذاہب چھوڑ کر مسلمان ہوئی ہے یا ان کے آباؤ اجداد مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے محض مسلمان ہو جانے سے وہ ایک جداگانہ قوم نہیں بن سکتے ...... جنہیں خدا نے ایک بنا دیا ہو، انسان انہیں کبھی دو نہیں بنا سکتا ...... میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے مذاہب ہیں کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے۔ کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا خدا ہے اور ہم سب ایک ہی خدا کے عیال ہیں خواہ ہم کسی نام سے کیوں نہ پکارے جائیں۔ میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بدل لیں۔
>
> (ہندوستان ٹائمز، ۱۴؍ اپریل ۱۹۴۰ء)

آپ نے غور فرمایا کہ (مہاتما) گاندھی، دو قومی نظریہ کی مخالفت میں کہاں تک پہنچ گئے! اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوا کہ ہندو اور مسلمان، دونوں قوموں کو ایک قوم بنایا کیسے جائے؟ اس کے لئے گاندھی جی نے جو تجویز فرمایا وہ قابلِ غور ہے۔ انہوں نے کہا کہ:-

> آج مسلمانوں کی تہذیب الگ ہے اور ہندوؤں کی الگ۔ ان دونوں تہذیبوں کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی تہذیب مرتب ہوگی۔
>
> (ہریجن - ہفتہ ۲۹)

پنڈت نہرو

مسٹر گاندھی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کی باری آتی ہے۔ انہوں نے، اپنی سوانح حیات میں جس کا نام "میری کہانی" ہے، لکھا تھا کہ:-

> ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے ...... سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نگاہ سے یہ بہت دور از کار ہے ...... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے!
>
> (میری کہانی، جلد دوم، صفحہ ۳۳۱)

اس کے ایک ہی صفحہ بعد لکھا:-

> مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔ اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقائق سے دوچار ہونے کے بعد اس تصور کا خاتمہ ہو جاتا۔
>
> (ایضاً، صفحہ ۳۳۲)

ازاں بعد انہوں نے آل انڈیا نیشنل کونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء کے خطبۂ صدارت میں بصد حسرت و تاسف کہا کہ:-

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں۔ گویا دو ملتوں اور قوموں کے

بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

یہ اُس دور کے ہندو لیڈروں کے خیالات کی دو ایک مثالیں تھیں۔ اس کے بعد مسلمان لیڈروں کی طرف آئیے۔ (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) ان کے خسر اور مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی دس قدم آگے تھے جب مسلم لیگ

ابوالکلام آزاد

نے طے کیا کہ مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور کی جائے گی تو ہندوؤں نے فیصلہ کیا کہ اُس سال کانگریس کے سالانہ اجلاس کے لئے (مولانا) آزاد کو صدر منتخب کیا جائے تاکہ جو کچھ مسلمان اپنے ہاں طے کریں اُس کی مخالفت، خود ایک مسلمان ہی کی زبان سے کرائی جائے۔ چنانچہ (مولانا) آزاد نے اپنے صدر منتخب ہونے کے بعد لاہور میں اپنی پہلی تقریر میں فرمایا کہ

> مسٹر جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے میں اس باب میں ان سے متفق نہیں۔ ("اسٹیٹسمین" مورخہ ۱۹ جنوری)

اس کے بعد انہوں نے (کانگریس کے اجلاس منعقدہ رام گڑھ میں) اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ یہ خیال کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں آباد ہیں، انگریزی سامراج کا پیدا کردہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ :-

> ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسانوں کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلے کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور پھر ایک کے بعد دوسرا۔ یہ سلسلہ جاری رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انہی قافلوں میں ایک تجازی قافلہ پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ پچھلے قافلوں کے نشانِ راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے یہاں بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ ظہور میں آیا اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ — فرمایا۔

> ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔

آپ نے خود فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کے لئے یہ نسخہ کہ نسلاً ہے جسے (کسی زمانے کے) "امام الہند" حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تجویز فرما رہے ہیں! یہ وہی نسخہ ہے جسے (ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ) مہاتما گاندھی نے پیش کیا تھا۔ یہ اسی ناقوسِ برہمن کی صدائے بازگشت ہے۔ یہی تھی ہمارے نیشنلسٹ مسلمانوں کی وہ کورانہ روش جس کے دردانگیز

احساس سے تڑپ کر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد — کہ جبریلِ امیں را دل خراشد

چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا — پرستد مومن و کافر تراشد

متحدہ قومیت کے متعلق اپنی اس تحقیقِ انیق کے بعد مولانا (آزاد) فرماتے ہیں ۔۔۔ اور دیکھیئے کس وجد و مسرت سے فرماتے ہیں کہ

> میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں ۔ میں ہندوستان کی ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔

آسمان کی آنکھ یہ تماشا دیکھ کر محوِ حیرت تھی کیونکہ اس کے کانوں نے اسی ابوالکلام آزاد کو یہ کہتے ہوئے اور پورے جذبۂ شوق اور جوش و خروش کے ساتھ کہتے ہوئے سنا تھا کہ

> انسان کی اجتماعی حیات یا قومیت درحقیقت ان تمام عقاید و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے جو نسل و وطن اور متوارث و متواصل علائقِ نسلی سے ترکیب پاتے تھے لیکن حضرات انبیاء کرام کا مشن یہ ہوتا تھا کہ ان تمام نسلی اور قومی امتیازات قدیمہ کو مٹا کر ایک نئی روحانی امتیاز و خصوصیت کی بنیاد پر نئی قومیت پیدا کریں ۔ ۔ ۔ ۔ اس قومیت کی بنیاد صرف اخوتِ دینی پر قائم ہوتی ہے اور اس طرح وہ جغرافیہ و نسل سے ماوراء رہ کر ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے ، اور زمین کا ہر ٹکڑہ ، نوعِ انسان کا ہر حصہ ، اقوام و ملل کی ہر نسل اس کے دامن میں پناہ لے سکتی ہے ۔ (البلاغ - ۱۵/۱۱ ۱۲ء)

اس کے بعد وہ کہا کرتے تھے کہ ،

> انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت و ضلالت تھی کہ اس نے رشتۂ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندانوں کی تفریقوں پر انسانی رشتے قائم کر لئے ۔ ۔ ۔ ۔ (ان سب کے برعکس) اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں بلکہ الٰہی تعبد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت و اتحاد کی دعوت دی ۔ ۔ ۔ ۔ لہٰذا اسلام کے نزدیک ، وطن و مقام اور رنگ و زبان کی کوئی تفریق نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ برادری خدا کی بنائی ہوئی برادری ہے ۔ ہر انسان جس نے کلمۂ لاالٰہ الا اللہ کا اقرار کر دیا ، بمجرد اس اقرار کے اس برادری میں شامل ہو گیا ۔ (الہلال - ۱۲/۸ ۱۳ء)

اور وضاحت سے کہا کرتے تھے ،

> ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں ۔ اسی طرح اور قومیں بھی ۔ لیکن مسلمانوں کی تو علیحدہ کوئی قومیت نہیں جو کسی خاص نسلی خاندان یا زمین کی جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو ۔ ان کی ہر حیثیت مذہب یا بالفاظِ مناسب قرآن کا نام کا رونا صرف خدا سے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آج دنیا قوم اور وطن کے نام میں جو تاثیر دیکھتی ہے مسلمانوں کے لئے وہ صرف اسلام یا خدا کے لفظ میں ہے ۔ (الہلال ۱۲/۸ ۱۳ء)

یہ دو تھا الہلال کے ابوالکلام آزاد تھے ۔ اور جس ابوالکلام آزاد کی ایک جھلک ہم پہلے دیکھ چکے ہیں ، وہ گاندھی کی بیعت

کے بعد کے ابوالکلام تھے۔ ایسی قسم کی قلب ماہیت کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

بہر حال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اسلام کی بنیاد پر مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے خلاف، ہندو لیڈروں نے چیخ و پکار شروع کی تو ان کے اتباع میں نیشنلسٹ مسلمانوں نے بھی وہی راگ الاپنا شروع کر دیا ــــ اور تاسف بالائے تاسف کہ ان میں مولانا حسین احمد مدنی جیسے شیخ الحدیث، اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے امام الہند پیش پیش تھے۔

یہ ائمہ کرام" کی حالت تھی۔ اس کے بعد ان کے مقتدیوں کو دیکھئے۔ ڈاکٹر سید محمود قومیت پرست مسلمانوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے یہ ایک قدم اور آگے بڑھے اور فرمایا کہ

ڈاکٹر سید محمود

لفظ ہندی کو زبان کے لئے نہیں بلکہ اہل ہند کے لئے اختیار کرنا چاہیئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف لوگ مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہم اس برِاعظم کی علیحدہ علیحدہ "مذہبی اقوام" ہیں۔ اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترک نام اختیار کریں۔

(ماہنامہ جامعہ۔ بابت اکتوبر ۱۹۳۷ء)

اور بیباکیٔ بخیر جناب جوش ملیح آبادی نے دس قدم آگے بڑھ کر فرمایا۔

جوش ملیح آبادی

اپنے آپ کو مسلم یا ہندو کہنے اور ہندوستانی نہ کہنا جغرافیائی صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی؟ قومیت تو ہمارا گوشت پوست اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت و وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقتِ بشری سے باہر ہے۔

(جوش صاحب کا اپنا رسالہ کلیم۔ بابت دسمبر ۱۹۳۷ء)

میں عزیزانِ من! انہی چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ ــــ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ــــ یہ تھا اس جنگ کا ایک محاذ ــــ یعنی مسئلہ قومیت ــــ جس پر طلوعِ اسلام نے ان تمام تیر اندازوں کا مسلسل و متواتر مقابلہ کیا۔ اور جس کامیابی سے مقابلہ کیا اس کا اندازہ اس کے اس زمانے کے فائلوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

دین اور سیاست کی ثنویت

اب اس میدانِ کارزار کے دوسرے محاذ کی طرف آیئے۔ یعنی ہمارے اس دعویٰ کی طرف کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ عقیدہ کا نام نہیں۔ یہ ایک اجتماعی نظامِ حیات ہے جس کا قیام صرف اپنی آزاد مملکت میں ہو سکتا ہے۔ اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ اسی کا نام نظریۂ پاکستان تھا۔ اس نظریہ کی مخالفت بھی نہایت شد و مد سے ہوئی۔ اس یورش کی داستان کا آغاز بھی ہم (مہاتما) گاندھی کے ایک قریب حریف سے کرتے ہیں جب قائداعظمؒ نے کہا کہ ہم ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب کی رُو سے متعین ہوں۔ تو مسٹر گاندھی تنک کر بولے۔

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے . . . مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ (ہریجن - ۲۲ء ۹)

پھر انہوں نے کہا:-

اگر مذہب کو عملی حالہ رہنے دیا جائے یعنی ایک ہی کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترک زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۶ء ۹)

پنڈت نہرو

پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا کہ:-

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور استحصال کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل مفادات کی بقا کا حامی ہے۔ (میری کہانی ص[14])

ڈیسائی

۱۹۴۳ء کا ذکر ہے۔ عید الفطر کی تقریب پر مجلس احرار (بمبئی) نے کانگریس کے مشہور لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی کو دعوت دی۔ انہوں نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ:-

چونکہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ معاملہ ہے اس لئے اسے سیاست سے ملانا نہیں چاہیئے۔ (ہندوستان ٹائمز - ۴۳ء ۹)

یہی مجلس احرار کا مسلک تھا۔ مسٹر ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، پکار کر کہا کہ:-

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کریں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم ہو سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز - ۴۳ء ۵)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے کانگریس کے نقیب جریدہ ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ:-

حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے میں گھتی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ مسلمانوں کے

ذمہ دار راہ نما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۴؍ ستمبر ۱۹۴۰ء)

ستیا موری

۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ یہ تجویز سامنے لائی گئی کہ مسلم لیگ اور کانگریس پر مشتمل مخلوط حکومتیں قائم کر لی جائیں اس پر اس زمانے کے مشہور کانگریسی لیڈر مسٹر ستیا موری نے کہا کہ:-

جب مسلم لیگ کا نصب العین یہ ہو کہ ملک میں اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ ہم اس کے ساتھ مل کر کس طرح حکومتیں بنا سکتے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۳؍ جون ۱۹۴۰ء)

مسٹر منشی

اکتوبر ۱۹۴۲ء میں لدھیانہ میں "اکھنڈ ہندوستان کانفرنس" کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ایک ممتاز کانگریسی لیڈر مسٹر منشی نے سامعین سے کہا کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے نظریۂ پاکستان کا بڑا چرچا کیا جا رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس نظریہ سے مقصود و مطلوب کیا ہے! اگر معلوم نہیں تو سن لیجئے کہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ:-

ہندوستان کے مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے اماکن و مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر سہروردی نے کہا ہے کہ ہم ملتِ اسلامیہ کے لئے ہندوستان میں ایسے خطے چاہتے ہیں جہاں ہم دنیا کا نقشہ اپنے مذہب کے خطوط پر متشکل کر سکیں۔ (مسٹر ہیبون اکتوبر ۱۹۴۲ء)

یہاں میں ایک ثانیہ کے لئے رکنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں "نظریۂ پاکستان" کی اصطلاح ایک معمہ بن رہی ہے اور کوئی متعین طور پر نہیں بتاتا کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ معمہ ہے لیکن آپ دیکھئے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ہندوستان کے ہندو اس کا متعین مفہوم کس وضاحت سے سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے لئے مسٹر منشی کے ان الفاظ کو پھر سامنے لائیے کہ نظریۂ پاکستان سے مفہوم ہے مسلمانوں کی ایسی مملکت جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے —! ہندوستان کا ہندو تو یہ بات سمجھتا تھا لیکن وائے بدبختی کہ آج پاکستان کا مسلمان اسے نہیں سمجھتا!

بہرحال اب آگے بڑھیے۔ مسٹر منشی نے ہندوستان کے ہندوؤں کو مسلم لیگ کے نصب العین یعنی قرآنی حکومت کے قیام کے (مزعومہ) خطرات سے متنبہ کیا، اور اس کے بعد کہا کہ

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ قومیت پرست مسلمانوں نے مسلم عوام تک پہنچ کر انہیں اس نظریۂ افتراق (پاکستان) کے خطرات سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟

آپ کو معلوم ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ نہیں معلوم تو ذرا کلیجہ تھام کر سنیئے۔ جلسہ میں جمعیت العلماء ہند کے رکن ایک مفتی صاحب تشریف فرما تھے۔ انہوں نے پکار کر کہا کہ ہم مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کریں گے۔ یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے! —— چنیں دورِ آسمان کم دیدہ باشد۔

اور ایک انہی مفتی صاحب پر کیا موقوف تھا "نیشنلسٹ علماء کرام" میں سے ہر ایک کا یہی مسلک تھا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ مسٹر گاندھی، جواہر لال نہرو، بھولا بھائی ڈیسائی، غرضیکہ تمام ہندو لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ ہم مذہب پر مبنی کسی نظامِ حکومت کی اجازت نہیں دے سکتے۔ نظامِ حکومت وہی قابلِ قبول ہوگا جس میں مذہب کو ایک پرائیویٹ عقیدہ کی حیثیت سے الگ رکھا جائے اور کاروبارِ حکومت جمہوری انداز سے چلایا جائے۔ اسے سیکولر نظامِ حکومت کہا جاتا ہے قائم

مولانا حسین احمد

ہے کہ یہ نظام، اسلامی نظامِ حکومت کی عین نقیض تھا لیکن مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔ اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔ (زمزم - ۱۹ جولائی ۱۹۳۸ء)

علامہ اقبالؒ نے (مولانا مدنی کے خلاف اپنے بیان میں) کہا تھا کہ اسلام ایک ایسا نظامِ خداوندی ہے جو اپنے ساتھ کسی غیر خداوندی نظام کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کے جواب میں مولانا مدنی (مرحوم) نے اپنے بیان میں کہا کہ

اسی طرح یہ کہنا کہ نظامِ اسلامی اور اس کا کار بندی دوسرے نظام کے ساتھ شریک ہی نہیں ہو سکتا، غیر قابلِ قبول امر ہے۔ (متحدہ قومیت اور اسلام - ص ۵۱)

سیکولر جمہوری نظامِ حکومت میں ہر مذہب کو عقائد، پرستش اور پرسنل لاز کی حد تک آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن امورِ مملکت میں مذہب دخیل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کا ہندو بار بار اعلان کرتا تھا کہ ہم مسلمانوں کے لئے مذہبی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔ مذہبی آزادی سے ان کا مطلب یہی تھا۔ مولانا مدنی نے ان کی اس ضمانت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔ (ایضاً - ص ۶۱)

مولانا مدنی مرحوم اور ان کے ہمنواؤں کا یہی تصورِ اسلام تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ تھی مسلمانوں کے معتدل طبقہ کی حالت۔ ان کا متشدد گروہ اس سے بھی دس قدم آگے جاتا تھا اور مذہب کا سیاست میں دخل انداز ہونا تو ایک طرف وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے تتبع میں خود مذہب ہی کو دنیا سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس باب میں ان کی دریدہ دہنی کا کیا عالم تھا، میں اس کی صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ آپ (میری طرح) اسے سینہ تھام کر سنیئے۔

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی اس طبقہ کے نمائندہ تھے۔ انہوں نے اپنے رسالہ کلیم کی نومبر ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

عظیم الشان پیغمبروں کی (معاذ اللہ معاذ اللہ) حسرتناک ناکامیاں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ مذہب کا بیان ہے کہ خدا نے انبیاء کے ذریعے نوعِ انسان کی اصلاح کرنی چاہی تھی اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے تھے مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اس کا جواب مجھ سے طلب نہ فرمایئے۔ عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر ذرا اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم کس راستے پر گامزن ہے۔

بہرحال یہ بھی تحریکِ پاکستان کے خلاف نیشنلسٹ مسلمانوں کی معرکہ آرائیوں کی ایک ہلکی سی جھلک۔ جب مسٹر گاندھی نے دیکھا کہ ان کے ان حربوں سے کامیابی نہیں ہو رہی تو انہوں نے اپنی ٹیکنیک کو بدلا اور یہ پرچار شروع کر دیا کہ مذاہب

سب مذاہب ایک جیسے ہیں

سب ایک جیسے ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ امن اور سلامتی کی راہ یہی ہے کہ ہم اس تعلیم کو عام کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کے لئے، ڈاکٹر ذاکر حسین خان (مرحوم) کی معاونت سے تعلیم کی ایک اسکیم مرتب کرائی جس کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی افضلیت حاصل نہیں (اسے "وار دھا کی تعلیمی اسکیم" کہا جاتا تھا۔ طلوعِ اسلام نے اس کی کس طرح مخالفت کی اور اسے ناکام بنا کر چھوڑا، یہ ایک الگ داستان ہے)۔ اس اسکیم کو متعارف کراتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:۔

> میں اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ بچوں کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں ان کے نزدیک بس وہی مذہب سچا ہے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز ۱۷؍۳؍۴۷)

آپ کو معلوم ہے کہ اس (بظاہر) انسانی رواداری اور پریم اور شانتی کے مہاتمائی اپدیش سے مقصد کیا تھا؟ یہ ہم سے نہیں، خود مہاتما گاندھی کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی کی زبان سے سنئے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

> ایک جداگانہ قوم ہونے کا تخیل پیدا ہی اس خیال سے ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔ جونہی ہم تمام مذاہب کی یکساں عزت کی عادت پیدا کر لیں، ہم محسوس کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہم ایک ہی نسل اور ایک ہی انسانی برادری ہیں۔ (ہریجن۔ ۹؍۳؍۲۵)

اس سے آپ کے سامنے یہ حقیقت بھی آ گئی ہوگی کہ مولانا آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر (ترجمان القرآن) کے مقدمہ کے سینکڑوں صفحات جو اس بات کے ثابت کرنے کے لئے صرف کئے تھے کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں، تو اس سے ان کا حقیقی مقصد کیا تھا۔ چنانچہ کانگریس نے اس تفسیر کے اس حصہ کا ہندی ترجمہ کرا کر لاکھوں کی تعداد میں ملک میں تقسیم کرایا تھا۔ یہی عالمگیر سچائیوں کے اشتراک کا تصور تھا جس کی بنا پر مسٹر آصف علی (مرحوم) کو ایک قدم آگے بڑھنے کی جرأت ہو گئی۔ بات یوں ہوئی کہ ۹ ستمبر ۱۹۳۲ء کو شملہ میں "تعلیم" کے عنوان پر ایک جلسہ میں مسٹر سیتہ مورتی کی تقریر تھی جس کی صدارت مسٹر آصف علی نے کی۔ تقریر کے بعد انہوں نے اپنے صدارتی ریمارکس میں سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

> تم کرشنؑ، بدھؑ، محمدؐ کو بھی پیغمبر کہتے ہو۔ مہاتما گاندھی بھی (معاذ اللہ) اسی قسم کے پیغمبر ہیں۔

اور مولانا آزاد نے کانگریس سیشن (رام گڑھ) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ

> وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا ایک ہی روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی روحِ عظیم کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ (خطبۂ صدارت۔ ص ۱۲)

اس سے ایک سال پہلے کا ذکر ہے کہ کانگریس کے ایک اجلاس میں مولانا آزاد کرسیِ صدارت پر براجمان تھے اور مولانا حسین احمد مدنی مع اپنی جماعت کے علمائے کرام کے اسٹیج کے ارد گرد تشریف فرما، اور پنڈت پنتھ تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر

میں کہا:

> آج ہمارے ملک میں مہاتما گاندھی کی ذاتِ گرامی ایسی ہے جو تمام نقائص سے مبرا اور تمام خطاؤں سے منزہ ہے۔
> (اسٹیٹسمین ۳۰ ؍ ۱۹۴۷ء)

اس پر نہ مولانا آزاد کی پیشانی پر بل آیا اور نہ ہی علمائے کرام میں سے کسی کی رگِ حمیت پھڑکی۔ یہ ہوتا ہے سیکولر حکومت میں جذبۂ اسلام اور غیرتِ ملّی کا حشر!

اس طرح "عالمگیر سچائیوں" کے پراپیگنڈہ سے فضا ہموار کرنے کے بعد اگلا قدم اٹھایا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے آپ کو لادین اور دہریہ کہنے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ اب دیکھئے کہ وہ اس نئے اقدام کو کس انداز سے پیش کرتے ہیں۔ آپ

برہمو سماجی اسلام

حضرات کو غالباً معلوم ہوگا کہ بنگال میں ایک تحریک اٹھی تھی جس کا نام برہمو سماج تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تمام مذاہب کے امتیازات ختم کر کے ایک ایسا نیا عالمگیر مذہب وضع کیا جائے جو جملہ مذاہب کی "عالمگیر سچائیوں" کا مجموعہ ہو۔ شروع ۱۹۲۹ء میں اس تحریک کے ایک مشہور راہنما شری کیشب چندر سین کی صد سالہ برسی کی تقریب منائی گئی۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا:

> ہندوستان میں اسلام ایک غلط طریق پر آیا۔ بایں ہمہ ان ہر دو متضاد تصوراتِ زندگی (اسلام اور ہندومت) میں امتزاج پیدا کرنے کے لئے ایک کو دوسرے میں جذب کرنے کا عمل شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ گرو نانک اور بھگت کبیر جیسی شخصیتوں اور اکبر جیسے بادشاہ کی کوششوں سے کافی ترقی کر گیا...... اس کے بعد یہ کوششیں ماند پڑ گئیں لیکن یہ سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا لیکن قبل اس کے کہ یہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا، ایک بیرونی طاقت ہندوستان میں آپہنچی۔
> (لائٹ ۱۰ ؍ ۱۹۴۹ء)

یعنی متحدہ قومیت اور سیکولر نظامِ حکومت کی کامیابی کی صورت یہ ہوگی کہ ہندومت اور اسلام کے امتزاج سے ایک نیا برہمو سماجی مذہب وضع کیا جائے — تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری — طلوعِ اسلام نے اس کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان تھا "سوراجی اسلام"۔ اس نے کانگریس کے اس جدید فریب کو بھی بے نقاب کر کے رکھ دیا۔

لیکن مسلمانوں کو اپنے مذہب سے جس قدر وابستگی تھی اس کے پیشِ نظر یہ محسوس کیا گیا کہ وہ اس قسم کے برہمو سماجی اسلام کو قبول نہیں کریں گے لہٰذا سوچا یہ گیا کہ اسے ایسے رنگ میں پیش کیا جائے جس سے مسلمان بدکیں نہیں بلکہ اسے اصل اسلام بلکہ مغزِ اسلام سمجھیں۔ اس سلسلہ میں دیوان لال چند ناول رائے نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا:

تصوف کو آگے بڑھایا جائے

> تصوف ہی وہ ذریعہ ہے جس کی رو سے امید کی جا سکتی ہے کہ تمام اہلِ ہند قومیتِ واحدہ کے رشتے میں پرو دیے جائیں گے اور یہی چیز ہندوستان کی سیاسی، معاشی، اور معاشرتی مسائل کے صحیح حل کی طرف راہ نمائی کر سکتی ہے۔
> (نیشنل کال ۲۶ ؍ ۱۹۴۳ء)

اسے (ہند دولت کے لئے) حسنِ اتفاق سمجھئے کہ انہی دنوں مولانا عبید اللہ سندھی، قریب بیس سال کی جلا وطنی کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ وہ بڑے پرانے قومیت پرست تھے، اور ماسکو وغیرہ کی سیاحت سے ان کے ذہن میں کمیونزم کے جراثیم بھی پرورش پا رہے تھے۔ بایں ہمہ علماء کی جماعت میں ان کا مرتبہ خاصا بلند تھا۔ انہوں نے جمعیت العلماء کی سرگرمیوں کا جائزہ

مولانا سندھی

لیا اور تجویز کیا کہ اسے دو شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان میں سے ایک شعبہ کے متعلق کہا کہ:۔ جمعیت العلماء کے اس شعبہ کو اسلامی فلاسفی کا محافظ ہونا چاہیئے۔ یہ اسلامی فلاسفی دراصل وہی ہندو فلاسفی ہے جسے مسلم صوفیائے کرام نے ہندوستان میں تکمیل کے درجہ تک پہنچایا ہے۔

(طلوعِ اسلام۔ جولائی ۱۹۳۹ء)

(۰)

یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! ایک خفیف سی جھلک اس آویزش کی جو تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں اس تحریک کے حامیوں اور ہندوؤں اور ان کے ہم نوا نیشنلسٹ مسلمانوں میں برپا تھی۔ سطحی نگاہ سے دیکھنے والے یہ سمجھتے تھے (اور اب بھی سمجھتے ہیں) کہ یہ (عام اصطلاح میں) ایک خالص سیاسی نزاع تھی جس کی رو سے مسلمان تقسیمِ ہند کا مطالبہ کر رہے تھے

کشمکش کی غایت

اور ہندو اس تقسیم کے خلاف تھے۔ لیکن اس نزاع کی جو چند ایک مثالیں میں نے آپ احباب کی خدمت میں پیش کی ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ یہ (عام تصور کے مطابق) خالص سیاسی جنگ نہیں تھی۔ یہ دراصل کفر اور اسلام کی جنگ تھی۔ حق اور باطل کی جنگ تھی۔ ہندو چاہتے تھے کہ ہندوستان میں اسلام کا جداگانہ تشخص باقی نہ رہے اور تحریکِ پاکستان کا مقصود و منتہا یہ تھا کہ اسے ایک الگ خطۂ زمین میں جیتے جاگتے نظام کی شکل میں قائم کیا جائے۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں جو اکثر کہا کرتا ہوں کہ تحریکِ پاکستان کی تائید اور اس کے ساتھ تعاون میرا جزوِ ایمان تھا اور اس خطۂ زمین کا استحکام اور سالمیت میرے دین کا تقاضا۔ تو یہ چیز محض جذباتی نہیں بلکہ مبنی بر حقیقت ہے۔ اس نشست میں میں نے صرف اتنا بتایا ہے کہ مطالبہ پاکستان کے مخالفین کی طرف سے کس کس سمت سے کس کس قسم کے حملے ہوتے تھے۔ یہ نہیں بتایا کہ طلوعِ اسلام نے ان حملوں کا کس طرح مقابلہ کیا۔ ایک تو اس لئے کہ اس تفصیل میں جانے کے لئے وقت نہیں اور دوسرا اس لئے کہ ان حملوں کی نوعیت سے آپ کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ ہم نے ان کا مقابلہ کس طرح سے کیا ہوگا۔ بہر حال یہ جنگ مسلسل لڑی گئی۔ اور آخر الامر حق کی فتح ہوئی اور پاکستان وجود میں آگیا۔ — حوریاں رقص کناں سجدۂ شکرانہ زدند۔

پاکستان وجود میں آگیا لیکن اس کے مخالفین نے اپنی مخالفت کو بدستور جاری رکھا۔ ظاہر ہے کہ ان مخالفین میں ہندو بھی شامل تھے اور وہ نیشنلسٹ مسلمان بھی جنہوں نے وہاں اس کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے اس پچیس سال

اب کیا حالت ہے

کے عرصہ میں کیا کچھ کیا۔ اس تفصیل سے صرفِ نظر کر کے بات یہاں سے شروع کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ بیں اسے دو لفظوں میں پھر دہرا دوں کہ نزاعی مسائل وہاں دو ہی تھے — نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ — اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، مخالفین میں ہندوؤں کے علاوہ نیشنلسٹ علماء، احرار، خدائی خدمتگار (سرخپوش)، سندھ کے آزاد، بنگال اور بہار کے انصار اور کمیونسٹ تھا، دہریئے سب شامل تھے۔ (جماعتِ اسلامی کی طرف سے مخالفت کا ایک اور انداز تھا اور وہ اب تک اپنے اسی انداز پر کام کئے جا رہی ہے اس لئے ان کا تذکرہ اس سرگذشت میں نہیں آرہا) پچیس سال سے ان سب کی مسلسل کوشش یہ چلی آرہی ہے کہ نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ کو باطل ثابت کر دیں۔ سال گذشتہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی انڈیا کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کامیابی کا اعلان اندرا گاندھی نے کن الفاظ سے کیا تھا۔

اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہماری فوجوں نے بہت بڑا میدان مارا یا ہم نے ایک مملکت فتح کر لیا ہے۔ اس نے کہا یہ تھا کہ

مسز اندرا گاندھی کا اعلان

یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہماری حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی اُس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ چالیس سال پہلے جو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ہندوؤں کی ہمارے خلاف سیاسی جنگ نہیں۔ یہ نظریات کی جنگ ہے۔ یہ حقیقت ان لوگوں کے دل سے کس طرح اچھل کر زبان پر آگئی۔ یہ اعلان مسز گاندھی ہی نے نہیں کیا تھا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کے نمائندہ مسٹر نذرالاسلام (جو اس زمانے میں نام نہاد بنگلہ دیش کے قائمقام صدر تھے) انہوں نے بھی یہی کہا تھا۔ انہوں نے اپنی ریڈیائی تقریر میں کہا تھا۔

مسٹر نذرالاسلام

ہماری یہ فتح نہ کسی فوج کی فتح ہے نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے مرپھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ اور حکومت کی بنیاد دین پر ہے سیکولرزم نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل۔ اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنا پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوط ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل کو مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلانے سے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

مسٹر نذرالاسلام نے کہا تھا کہ اگر پاکستانی مسلمانوں نے اب بھی اپنا غلط نظریہ نہ چھوڑا تو جو حشر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے

مسٹر رشید

وہی مغربی پاکستان کا ہوگا۔ اس کی یہ بات محض شاعرانہ جذبہ نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جس قسم کے نیشنلسٹ مسلمانوں نے مشرقی پاکستان کا یہ حشر کرایا ہے اسی قسم کے نیشنلسٹ مسلمان مغربی پاکستان میں بھی سرگرم عمل ہیں۔ ان کی سرگرمیاں شروع ہی سے چلی آرہی تھیں لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یہ کھل کر سامنے آگئے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ پچھلے اگست میں سندھ کے مسٹر جی۔ ایم سید نے طلباء اور دانشوروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:-

حالات اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان کا کوئی وجود نہیں اور حقیقت میں سندھیوں کو لوٹنے

کے لئے یہ ڈھونگ کھڑا کیا گیا تھا۔ (امروز۔ ۴؍ اگست ۱۹۷۲ء)

بلوچستان کے نوائیدہ ہفتہ وار سنگت نے اپنی دوسری ہی اشاعت میں لکھا کہ پاکستان کے آئندہ دستور میں اس کی وضاحت کر دینی چاہیئے کہ ملک کا دستور پورے طور پر سیکولر ہوگا۔ خان عبدالولی خان کی نیپ کے منشور میں یہ شق شامل ہے کہ ملک کا

خان ولی خان

دستور سیکولر ہوگا۔ اپنے اس مسلک کو انہوں نے گذشتہ ستمبر میں لندن کے ایک بیان میں بھی دہرایا۔ (ڈان ۲۸؍ ستمبر ۱۹۷۲ء)۔ گذشتہ اکتوبر کو انہوں نے لندن میں نمائندہ نوائے وقت کو ایک انٹرویو دیا جس کے دوران اس نمائندہ نے سوال کیا کہ

> آپ نے پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانے کا تازہ اعلان کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان جس نظریہ کی بنا پر وجود میں آیا تھا وہ مٹ چکا ہے۔

مسٹر ولی خان نے نمائندہ کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ اس وقت سوال پاکستان کو بچانے کا ہے۔ ایسے غیر ضروری مسئلوں کو چھیڑنا نہیں چاہیئے۔ (نوائے وقت، ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۷۲ء)۔ اس سے تو یہ کہا لیکن دوسرے ہی دن بریڈفورڈ میں پاکستانیوں کے ایک منتخب اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

> دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت اسی نظریہ کو غلط طور پر اساس بنایا گیا تھا۔ لیکن کسی بھی قوم کو زیادہ دیر تک محض جذباتی نعروں سے بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اب بھی اس بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ ۔ ۔ ۔ ماؤنٹ بیٹن نے جب اپنے اختیارات پاکستان کے گورنر جنرل کو تفویض کئے تھے تو ہم نے اس وقت بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اس وقت ہمیں غدار کہا گیا تھا لیکن آج دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور اسلام ہی کے نام پر ٹوٹا ہے۔
>
> (نوائے وقت۔ ۱۳؍ اکتوبر۔ نیز نظریۂ پاکستان ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

میں نے شروع میں بتایا تھا کہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے کہا تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیکولر حکومت میں شرکت اسلام کے خلاف نہیں۔ مفتی محمود صاحب انہی مولانا مرحوم کے شاگردوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اب اس نیپ کے ساتھ مل کر جس کے منشور میں سیکولر حکومت شامل ہے سرحد میں حکومت قائم کی ہے اور اسے عین مطابق اسلام قرار دے رہے ہیں۔ خان ولی خان نے کہا ہے کہ جب ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو اختیارات آزادی تفویض کئے تھے تو ہم نے اس وقت بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی کا (اس زمانے میں) مجلس احرار کے نامور رہنماؤں میں شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے گذشتہ جون میں کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

مولانا ہزاروی

> میں آج محترمہ اندرا گاندھی کو خطاب کرنا چاہتا ہوں۔ میں تحریک آزادی وطن میں ابتدا سے شریک رہا ہوں اور جب آپ کے والد پنڈت جواہر لال نہرو قصبہ بفا میں آئے تھے اور انہیں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا وہ میں نے لکھا تھا۔ انہوں نے اسے سنبھال کر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ ہماری جماعت نے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے ملکی تقسیم کو ملک و قوم اور اسلامی مفادات کے مطابق نہیں سمجھا تھا اور اس لئے ہم نے تقسیم کی مخالفت کی تھی۔ مگر آپ

بڑوں نے ملکی تقسیم کا فیصلہ کرتے وقت ہم لوگوں کو بالکل نظر انداز کر کے ہمیں مشکلات میں ڈال دیا جو کسی وفادار ساتھی کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔　　(جنگ ۔ ۱۴ مئی)

آپ کو معلوم ہے کہ مولانا ہزاروی کی طرف سے یہ سنداتِ وفا شعاری اور شکایت ہائے رنگیں مسز اندرا گاندھی کے حضور کس وقت پیش کی جا رہی تھیں۔ اس وقت جب صدر پاکستان مذاکرات کے لئے ہندوستان جانے والے تھے۔ ان یاد دہانیوں سے کہنا یہ مقصود تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے مستقبل کے متعلق فیصلوں میں ہم وفا شعارانِ ازلی کو فراموش نہ کیا جائے۔ ہماری خدمات کا خیال رکھا جائے!

ان کے علاوہ شیخ حامد محمود صاحب نے اپنے ایک مبسوط مقالہ میں جو پاکستان ٹائمز کی ۲۷ جون ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ لکھا تھا۔

شیخ حامد محمود

پاکستان کی آئیڈیالوجی کے متعلق سادہ الفاظ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ پاکستان میں اسلامک اسٹیٹ یا تھیاکریسی یا "پان اسلامک" سیاسی نظام قائم کیا جائے۔ یہ چیز مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کا منطقی نتیجہ تو ہو سکتی ہے لیکن یہ اس آئیڈیالوجی کی بنیاد ہرگز نہیں۔

پنجاب کے وزیر تعلیم ڈاکٹر عبد الخالق صاحب نے گذشتہ جون میں اسمبلی کے اجلاس میں فرمایا کہ

ڈاکٹر عبد الخالق

ہر کوئی نظریہ پاکستان کی بات تو کرتا ہے لیکن خود قائد اعظم نے نظریہ پاکستان کا ذکر تک نہیں کیا۔ قائد اعظم نے مسلمانوں کے معاشی استحصال سے متاثر ہو کر پاکستان کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی اور مسلمانوں کی معاشی خوشحالی ان کا مقصد تھا۔

(نوائے وقت ۔ ۲۷ جون)

کراچی کے ایک صاحب مظہر یوسف نامی ایک قدم آگے بڑھے اور فرمایا کہ

قائد اعظم نے ایک بار نہیں بار بار فرمایا کہ پاکستان ایک ماڈرن سیکولر اسٹیٹ ہو گا۔

(ڈیلی نیوز۔ کراچی۔ ۱۲ مئی)

چلئے چھٹی پائی۔

ہندوستان کی وزارت خارجہ

جہاں تک دو قومی نظریہ کا تعلق ہے گذشتہ اپریل میں ہندوستان کی وزارت خارجہ کی طرف سے ایک رپورٹ اخبارات میں بھیجی گئی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا کہ:-

دو قوموں والا نظریہ ہی باعث تھا برصغیر کے امن و آشتی میں رخنہ اندازی کا۔ اب چونکہ یہ نظریہ مسمار ہو چکا ہے، تو ہندوستان کی نظروں میں اب ہندوستان اور پاکستان کے مابین تعلقات کے معمول پر آنے اور صلح و دوستی کے قائم ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ "بنگلہ دیش" کے قائم ہونے سے یہ تصور بھی ختم ہو گیا ہے کہ ریاستیں مذہب کی بنیاد پر بن سکتی ہیں۔　　(رائٹرز ایجنسی۔ بحوالہ چٹان ۱۵ مئی)

دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد ڈھاکہ کے اخبار (FORUM) نے اپنی ۳ جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا:-

۷ دسمبر ۱۹۷۰ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہلِ پاکستان میں وجہِ جامعیت مذہب ہے۔ انتخابات نے اس کی غلطی کھول دی..... اور نظریۂ پاکستان کی وہ تمام نگاہ فریب خوش نمائیاں جنہیں قدیم رجعت پسند اور متحصال پرور طبقہ اس شدومد سے پیش کرتا تھا، افسانہ بن کر رہ گئیں۔

مسٹر سید

اوائل ۱۹۷۲ء میں مسٹر جی۔ ایم سید کی سالگرہ منائی گئی۔ اس تقریب پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ:-

> پاکستان کے موجودہ انتشار اور افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے یعنی دو قومی نظریہ، مذہبی نظامِ حکومت کا تخیل، فسطائی نظریۂ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔

اس کے بعد انہوں نے مطالبہ کیا کہ:-

> ۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیرباد کہا جائے اور پاکستان میں ۵ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں کی سیاست کو مکمل خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے۔ (المنیر۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۲ء)

یعنی اسلام نے تو مسلموں اور غیر مسلموں کو دو الگ الگ قومیں قرار دیا تھا؛ اور یہ حضرت خود مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو

چار قومیتوں کا فتنہ

چار قوموں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ مغربی پاکستان میں متعدد قوموں کا شوشہ درحقیقت روس کا چھوڑا ہوا ہے۔ مشہور روسی مصنف گانکوفسکی نے اپنی تصانیف "تاریخ پاکستان" اور "پاکستان کے عوام" میں اس تصور کو پیش کیا تھا۔ روس کے اس نعرہ کی صدائے بازگشت کے طور پر ۱۹۶۸ء میں کراچی میں "عوامی ادبی انجمن" کے نام سے ایک تنظیم ظہور میں آئی۔ اس کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر "دانشورانِ ملت" جوش ملیح آبادی (جن کا ذکرِ خیر آپ اس سے پہلے سن چکے ہیں) اور فیض احمد فیض صاحب کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں انہوں نے کہا تھا: "پاکستان مختلف قوموں کا ملک ہے جو مساوی حقوق کی مالک ہیں"۔

وطنیت کی بنیاد پر قومیتوں کی جو لہر اٹھی تو وبا کی طرح پھیل گئی اور اب مختلف سمتوں اور گوشوں کی طرف سے یہی آواز ابھر رہی ہے۔ گذشتہ فروری میں نیشنل عوامی پارٹی کا ایک کنونشن کراچی میں منعقد ہوا۔ اس میں ایک قرارداد میں کہا گیا کہ:-

> پارٹی کا موقف یہ ہے کہ متعدد قومیتوں پر مشتمل ایک ملک ہے جو مساوی سیاسی حقوق کی مستحق ہیں۔
> (امروز۔ ۸ ۲/۷۲)

ادھر سے خان عبد الولی خان نے کلکتہ کے اخبار "ہندوستان اسٹینڈرڈ" کے نمائندہ سین گپتا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ:-

> بنگلہ دیش کے وجود میں آجانے سے دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ (نوائے وقت ۱۰ ۹/۷۲)

یہ صاحبزادہ صاحب کی آواز تھی؛ ان کے والد بزرگوار (خان عبد الغفار خان) نے افغانستان میں بیٹھے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے مسٹر دلیپ کمار مکرجی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ

> چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہیگا۔ اس کی بجائے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہوگی۔

کوئٹہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار "سنگت" نے اپنے دوسرے شمارہ میں (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) لکھا کہ:-

ملک کے دستور میں سب سے پہلے اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ پاکستان ایک کثیر القومی سیاست ہے۔ اور اس میں شامل چاروں قومیتیں ہر لحاظ سے یکساں حقوق کی مالک ہیں۔

سندھ کی ایک بیٹی ——غزالہ بلوچ —— اپنے ایک خط میں جو کراچی سے شائع ہونے والے اخبار 'ڈیلی نیوز' کی ۲۲ اگست ۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، لکھتی ہیں کہ

> بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن سے شروع ہوتی ہے جب انہوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں میں جذب ہو جاتے تو وہ آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گذار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی"۔ اب بھی پاکستان میں بسنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پسند قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں۔

بلوچستان کے وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل نے کہا ہے کہ "جس دو قومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ خلیج بنگال میں غرق ہو چکا ہے اور اسے غرق کرنے کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنہیں عوام نے سبز جھالوں کے منشور کی بنیاد پر اقتدار سونپ رکھا ہے۔" (نوائے وقت ۱۸ اکتوبر ۷۲ء) - وہیں کے گورنر میر غوث بخش بزنجو کے خیالات ڈھکے چھپے نہیں۔ اگلے دنوں انہوں نے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ

> پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کی تاریخ، جغرافیائی حدود، تہذیب، ثقافت، ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا معاشرہ جدا ہے۔ ہمارا مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحد رکھنے کی کیا اساس ہے۔ انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعے سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔ جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہوں گے۔ جب کسی غیر ملک سے بات ہو گی تو پاکستانی قوم کی بات ہو گی۔ (نوائے وقت - ۱۴ اکتوبر ۷۲ء)

اور تو اور، مرکزی وزیر مواصلات مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی نے اپنی پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے واضح طور پر کہہ دیا کہ پارٹی کے منشور کے مطابق پاکستان میں چار قومیں —— سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچ آباد ہیں اور پارٹی منشور کے مطابق کام کرے گی۔[1] (نوائے وقت - ۱۸ جولائی ۷۲ء)

یہ ہیں عزیزانِ من! نظریۂ پاکستان (یعنی اسلام کی بنیاد پر حکومت کے قیام) اور دو قومی نظریہ (یعنی ایمان کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کے خلاف وہ خیالات جو آجکل ملک میں عام پھیلائے جا رہے ہیں)۔ میں نے پہلے بتایا ہے

---

[1] میرے سامنے اس وقت پیپلز پارٹی کا منشور نہیں جو میں اس سے اس بیان کی تصدیق کر لیتا۔ لیکن جب کہنے والے خود اس پارٹی کے ایسے ذمہ دار رکن ہیں تو بات ٹھیک ہی ہو گی۔

کہ ہندوستان میں ہندوؤں کا آخری حربہ یہ تھا کہ ملک میں ایک ایسے نئے مذہب کو رائج کیا جائے جس میں ہندو مت اور اسلام کا امتیاز ختم ہو جائے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس کے لئے ہمارے پاس تصوف کی بنیاد پہلے سے موجود ہے۔ یہ بڑا خطرناک حربہ تھا۔ قیامِ پاکستان نے ہمیں اس سے بچا لیا۔ لیکن اب مسٹر جی۔ ایم۔ سید اسی نظریہ کو لے کر پھر اُٹھے ہیں۔

مسٹر سید کا پیش کردہ اسلام

انہوں نے سندھی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا اردو ترجمہ اسی سال "جیسا میں نے دیکھا" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے پہلے اسلام کی بنیادوں کو مسمار کیا ہے۔ اس کے لئے وہ وحی کے عقیدے کو توہم پرستی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> بانیانِ مذہب کی جانب سے فوق العقل علم اور الہامی معلومات کے دعوے کی ایک وجہ لوگوں میں اپنے نیک پیغام کی اہمیت کا احساس پیدا کرتا تھا۔　　(صفحہ ۳۳)

یعنی بانیانِ مذاہب نے جو وحی کا دعوےٰ کیا تو وہ (معاذ اللہ) دروغِ مصلحت آمیز تھا جس کا مقصد عوام کے دل میں اپنے خیالات کی اہمیت پیدا کرنا تھا۔ اسلامی ضابطۂ حیات کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

> مسلمانوں نے عرب کے قدیم مذہبی دستوروں میں حسبِ ضرورت ترمیم و اضافہ کر کے اپنے لئے مذہبی دستور مرتب کیا ہے۔ نہ سارے قدیم ضابطے رد کئے ہیں، نہ سارے ضابطے نئے اپنائے ہیں۔　　(صفحہ ۵)

اسلام (یا دیگر مذاہب) کے متعلق ارشاد ہے۔

> یہ دعویٰ کہ ان کے مذاہب بنی نوعِ انسان کے جملہ مسائل کا مکمل حل رکھتے ہیں اور صحیح اور آخری نظریہ حیات صرف انہی کا مسلک پیش کرتا ہے، قانونِ ارتقاء کے خلاف ہے۔ ایسا دعویٰ صرف مفادی گروہوں کا تحفظ کرنے اور ان کی گرفتوں کو مضبوط بنانے کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔　　(صفحہ ۶۳)

اسلام کی تشریح کرنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ

> (۱) انہوں نے اسلام کو دنیا کا آخری اور واحد دین قرار دیا اور اس کے علاوہ جملہ مذاہب کو منسوخ اور گمراہ ظاہر کرنے پر زور دیا۔
>
> (۲) دین کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلام کو نوعِ انسانی کے جملہ مسائل کا حل ثابت کرتے ہوئے مکمل فلسفۂ حیات بھی قرار دیا۔
>
> (۳) انہوں نے دنیا اور آخرت کے جملہ علوم و تعلیمات کا مخزن قرآن شریف کو سمجھنے پر زور دیا جسے رسول اکرمؐ پر نازل ہونے والا خدا کا کلام مانا جاتا ہے۔ ان کی جانب سے اس میں ہر زمانہ، ہر ماحول اور ہر مسئلہ کے لئے ایسے حل کے موجود ہونے پر اصرار کیا جاتا ہے جو اٹل اور ازلی اور ابدی حیثیت رکھتے ہیں۔
>
> (۴) حضرت محمدؐ کو انہوں نے خدا کا آخری پیغامبر ہی نہیں، دنیا کا آخری مصلح اور راہنما تسلیم کرنے پر زور دیا ہے۔
>
> (صفحات ۹۶ - ۹۷)

آپ عزیزانِ من! غور کیجئے کہ کیا یہ خیالات لفظاً لفظاً وہی نہیں جنہیں مسٹر گاندھی نے اسلام کا جداگانہ تشخص ختم کرنے کے لئے واردھا کی تعلیمی اسکیم اور اپنی دیگر تحریروں میں بیان کیا تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ مسٹر سید اسی تصوف کو اس مسئلے کا حل بتلاتے ہیں جسے ہندو لیڈروں نے آخر الامر پیش کیا تھا۔ مسٹر سید لکھتے ہیں کہ :-

صحیح ترین تصورِ حیات تصوف ہے جس کا اہم اصول وحدتِ مذاہب ہے تصوف عدم تشدد یا اہنسا، کا حامی ہے وہ حق و صداقت پر کسی مخصوص گروہ کی اجارہ داری تصور نہیں کرتا، وہ کسی بھی مذہبی اقتصادی اور سیاسی نظریہ کو حرفِ آخر جان کر اس کی اندھی تقلید سے گریز کرتا ہے۔ (صفحہ ۲۰۶ - ۲۰۵)

اور آخر میں وہ مقصد بھی سُن لیجئے جس کے لئے تصوف کو اختیار کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ سید صاحب اپنی کتاب کے آخری صفحہ پر لکھتے ہیں کہ:-

وہی تصوف کا حربہ

صوفی مذاہب و عقیدہ کی بنیاد پر قومیت استوار کرنے کے خلاف ہے۔ اور مذاہب کے موجودہ تعصبات کو درست نہیں سمجھتا۔ وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا حامی ہے۔ (صفحہ ۲۰۷)

آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی نظریۂ حیات اور نظریۂ قومیت کو باطل قرار دینے کے لئے کن کن راستوں سے اور کس کس قسم کے حربوں سے یورشیں کی جا رہی ہیں۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ وطنیت کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے تصور کا نتیجہ یا تو لادینی ہوگا اور یا اسلام کو اجتماعی نظامِ حیات کی جگہ صرف نظری اخلاقیات تصور کر لیا جائے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وطنیت کا نظریہ کس طرح اس حقیقت کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچا رہا ہے! یہی نیشنلسٹ مسلمان تھے جنہوں نے ہندوستان میں اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے لئے یہی حربے استعمال کئے اور وہی نیشنلسٹ مسلمان یہاں بھی وہی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ سچ کہا تھا اقبال نے کہ

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسداللّٰہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ حامیانِ پاکستان اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی نزاع نہ ہندوستان میں محض سیاسی نزاع تھی اور نہ یہاں اس کی نوعیت محض سیاسی ہے یہی تھی وہ حقیقت جس کے لئے قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ:-

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان صرف یک ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔ یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ (تقاریر۔ جلد اول صفحہ ۲۶۷، جلد دوم صفحہ ۲۵۵)

جو بات قائداعظمؒ نے اس زمانے میں برصغیر کے متعلق کہی تھی، آج وہی بات پاکستان کے اس بچے کھچے حصے کے متعلق کہی جا سکتی ہے کہ اگر یہاں ان نیشنلسٹوں کے مذموم عزائم کامیاب ہو گئے تو (خدا نخواستہ) نہ پاکستان باقی رہے گا اور نہ اس خطۂ ارض میں اسلام کا نام و نشان! یہی ہندو کا مقصد تھا جس میں وہ نصف پاکستان کی حد تک کامیاب ہو گیا ہے اور بقیہ نصف کے لئے وہ اپنے ان دیرینہ ساتھیوں کی مدد سے مصروفِ جدوجہد ہے۔

(۰)

آج پھر وہی حالات ہیں!

یہ تھے "عزیزانِ من! وہ حالات جن کے پیشِ نظر مجھے ۱۹۳۸ء میں اس معرکۂ دین و وطن میں نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ اور آج چونتیس سال کے بعد پھر اسی قسم کے حالات

سامنے آرہے ہیں۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں نے اپنے اس خطاب کا موضوع یہ کیوں تجویز کیا ہے کہ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو! کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

اگرچہ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس پچیس سال کے عرصہ میں بھی ہماری یہ مہم برابر جاری رہی ہے اور ہم بظاہر اس کا مقابلہ بھی کرتے رہے ہیں لیکن جو شدت اس نے اب اختیار کر لی ہے اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کشمکش کی یہی وہ شدت ہے جو مجھے پکار پکار کر دعوتِ مبارزت دے رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ۱۹۳۸ء اور آج کے حالات میں بڑا فرق ہے۔ اُس زمانے میں ایک تو ہمیں قائداعظمؒ جیسے رہبرِ فرزانہ کی قیادت حاصل تھی اور پھر میری عمر کا بھی وہ حصہ تھا جس میں توانائیاں بھرپور ہوتی ہیں۔ لیکن میں جب دوسری طرف دیکھتا ہوں تو آج کے حالات کو اس زمانے کے مقابلہ میں زیادہ مساعد پاتا ہوں۔ جہاں تک قائداعظمؒ کا تعلق ہے قرآنِ کریم ہمیں شخصیتوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ وہ نہیں ہیں تو نہ سہی۔ خدائے حی و قیوم کی زندہ و پائندہ کتاب ہماری راہنمائی کے لئے موجود ہے۔ اور جہاں تک میری عمر کا تعلق ہے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ میداِ فیض کی کرم گستری سے

بلند تر ہے حوادثِ گلستاں سے میرا مذاقِ فطرت
چمن میں بھی مسکرا رہا تھا، قفس میں بھی مسکرا رہا ہوں

علاوہ ازیں عمر کے تقاضے سے میری طبیعی توانائیوں کی کمی پورے کرنے کی ایسی شکل پیدا ہوگئی ہے جس کی وجہ سے مجھے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ جب میں نے ۱۹۳۸ء میں اس تحریک کا آغاز کیا تھا تو سیکرٹریٹ کے دو تین دوستوں کے سوا کوئی اور میرے ساتھ نہیں تھا۔ اس بے سروسامانی اور بے یارومددگاری کے زمانے میں ہم نے اتنی بڑی مہم سر کر لی تو (اس کے مقابل میں) آج آپ جیسے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں مخلص رفقائے سفر میرے ساتھ ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کس بات کا غم ہے!

تم جو اپنے شریکِ حال رہے　　گردشِ آسماں سے کچھ نہ ہوا

مجھے آپ کی ہمت اور رفاقت پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ خدا کی کتاب کی شمعِ درخشندہ آگے آگے، اور آپ جیسے زمیلانِ مخلص کا قافلۂ ذوق و شوق پیچھے پیچھے۔ اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہیئے۔

بے دست و پا تیم کہ ہنوز از وفورِ عشق
سوداست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

اس معرکۂ دین و وطن میں ہمارا پروگرام بھی نیا نہیں ہوگا۔ ہم نے نہ عملی سیاسیات میں حصہ لینا ہے نہ ہنگامے برپا کرنے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر کسی سے ٹکراؤ ہے، نہ الجھاؤ۔ ہم نے اپنے معمول و دستور کے مطابق، قرآنی فکر کو نہایت امن و سکون کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حد تک عام کرتے جانا ہے۔ اسی طریق سے ہم نے پہلے میدان مارا تھا۔ اسی سے اب بھی، بفضلِ ایزدی کامیابی و کامرانی حاصل ہوگی۔ آپ اسی روشِ قدیم کے مطابق، اس کی ابتدا کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اندھیرے کس طرح چھٹتے اور روشنیاں کس طرح بڑھتی ہیں۔ ہمارا تجربہ شاہد ہے کہ

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں　✧　تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

میں جانتا ہوں کہ ملک کی بڑی بڑی تنظیمیں جن کے ہاں زر و سیم کا سیلاب امنڈے چلا آتا ہے ہماری اس بے سامانی پر ہنستی ہیں اور کہتی ہیں کہ ـــــ ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر ـــ لیکن آپ ان سے پوچھیے کہ اس بے پناہ ساز و سامان کے باوجود ان کے نامۂ اعمال میں سوائے تخریبات کے اور ہے کیا؟ آپ عزیزانِ من! ان مخالفوں کی باتوں پر نہ جائیے۔ آپ کا جنونِ شوق ان کے ہزار ہا دی ساز و سامان سے زیادہ گراں قدر اور نتیجہ خیز ہے۔

کہے زمانہ جو دیوانہ، کوئی بات نہیں ؛ اٹھاؤ ہاتھ میں پیمانہ، کوئی بات نہیں

آپ اس عزم کے ساتھ اٹھیے اور پھر دیکھیے کہ بارگاہِ ایزدی سے کس طرح سحابِ کرم کی بارش ہوتی ہے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ ایک بار پھر:

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور خونِ گلچیں سے کلی رنگیں نوا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اور آخر میں مجھے ایک بار پھر خدائے رب العالمین سے وہی دعا مانگنی ہے جس دعا کے ساتھ میں پہلی بار اس معرکہ کارزار میں اترا تھا کہ

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ ـــــ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

والسلام!

از شاہد عادل

تفہیم القرآن جلد اوّل (مولانا مودودی) پر ایک نظر

مجموعۂ تضادات

عرب شاعروں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی کی شان میں قصیدہ کہتے تھے تو اس کی ابتدا اپنی معشوق یا حسین عورتوں کی تعریف سے کرتے تھے۔ ان عاشقانہ اشعار میں شدتِ عشق و فراق کی شکایت کرنے کے بعد ان حسین عورتوں کے ایسے ایسے اوصاف بیان کئے جاتے کہ ہر آنے جانے والا سب کچھ چھوڑ چھاڑ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عاشقانہ اشعار سے سب کو دلچسپی ہوتی ہے اور کوئی لاکھ چھپائے ہر سلیم الفطرت انسان کو عورت سے محبت ہوتی ہے چاہے یہ محبت جائز طریقے پر ہو یا ناجائز طریقے پر۔ چنانچہ ان عاشقانہ اشعار کے ذریعے جب بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو جاتا تو پھر شاعر اپنے ممدوح کی تعریف شروع کر دیتا اور اس کی شان اپنی معشوقہ سے بھی اونچی ثابت کر دکھاتا۔ قارئین سوچتے ہوں گے کہ اس تمہید کا قرآن مجید کی تفسیر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ آج کل جماعت اسلامی والے ٹھیک اسی اصول پر عمل پیرا ہو رہے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ جماعت کے آدمی بیٹھے بیٹھے ملک کے مشہور قانون دان مسٹر اے کے بروہی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیں گے کہ صاحب موصوف پاکستان کے نہ صرف سب سے اونچے قانون دان ہیں بلکہ وہ ایک عظیم مفکر اور فلسفی بھی ہیں، پاکستانی دستور پر ان کی کتاب دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ پاکستان کے وزیر قانون بھی رہ چکے ہیں اور اقوام متحدہ میں بھی ان کی فکر کی گونج سنائی دیتی رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور اس کے بعد فوراً اپنے مطلب کی طرف آ جائیں گے کہ ان جیسی بین الاقوامی ہستی نے مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کی شان میں فرمایا ہے کہ صدیوں سے ایسی شاندار تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اب مودودی صاحب کی تفسیر راقم کی نظر سے گزر چکی تھی۔ اور اس میں "جو کچھ" ہے اس کی بنا پر راقم نے یہ دعویٰ کر دیا کہ مسٹر اے کے بروہی نے تفہیم القرآن کا بالکل مطالعہ نہیں فرمایا۔ کیونکہ اس کے مطالعہ کے بعد کوئی سلیم الفطرت آدمی اس کی تعریف نہیں کر سکتا چہ جائیکہ وہ پاکستان کا سب سے اعلیٰ قانونی دماغ ہو۔ چنانچہ راقم نے جن بنیادوں پر یہ دعوے کیا تھا انہیں قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔

قرآن مجید کی ہزاروں تفاسیر لکھی جا چکی ہیں اور اگر کوئی صاحب علم کسی زمانے میں اس پر مزید اضافہ کرنا چاہتا ہے تو

نئی تفسیر کی گنجائش اس کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ اس دور کے تقاضے کچھ بدل جاتے ہیں جس کی وجہ سے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں وہ ان کا حل قرآن مجید کی روشنی میں پیش کرتا ہے عقائد مثلاً توحید باری تعالیٰ، رسالت اور معاد یعنی قیامت پر ایمان وغیرہ تو ایسے عنوانات ہیں کہ قرآن مجید کی تفاسیر ان کی تفصیلات سے بھری ہوئی ہیں اور مودودی صاحب کی تفہیم القرآن سے بھی زیادہ عمدہ طریقے پر اور زیادہ مفصل بیان ہو چکے ہیں۔ اب ان کی تفسیر کی یہ وجہ جواز صرف یہ رہ جاتی ہے کہ وہ موجودہ معاشرے کو درپیش مسائل کا حل کس طرح پیش فرماتے ہیں۔ اس لئے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم بھی صرف انہی اہم مسائل کو سامنے رکھیں گے جن سے ہمارے معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے میں مدد ملنے یا ملنے کی توقع ہو۔

نذر ماننا عام جہالت کی وجہ سے ہمارے عوام میں یہ چیز ایک دینی رسم اختیار کر چکی ہے۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کے نام پر بھی مانی جاتی ہے تاہم ضعیف الاعتقاد لوگوں نے اس اجازت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غیر اللہ کی نذر بھی ماننی شروع کر دی جو سراسر خلاف اسلام تھی۔ چنانچہ علماء نے اس کے خلاف جو آواز اٹھائی وہ زیادہ تر نذر کی اسی دوسری قسم سے متعلق تھی۔ مودودی صاحب اس سلسلے میں اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد اول طبع سوم کے صفحہ نمبر ۲۰۶ پر فرماتے ہیں:-

"نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے بر آنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اوپر لازم کرے جو اس کے ذمے فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو اور اللہ سے مانگی گئی ہو اور اس کے بر آنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے وہ اللہ ہی کے لئے ہو تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔"

طلوعِ اسلام کو گالی دینے کی وجہ سے مودودی صاحب کے اپنے حلقہ کے لوگوں نے انہیں (مودودی صاحب کو) عاشقِ سنت کا خطاب دے رکھا ہے۔ لیکن یہ عاشقِ سنت جس طرح سنت سے سلوک کرتا ہے اس کا اندازہ اسی امر سے لگائیں کہ جس چیز سے رسول صلعم منع فرماتے ہیں مودودی صاحب اسے اجر و ثواب کا موجب قرار دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے:-

وَعن ابن عمر قال نہی رَسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وَسلم عن النذر وقال اِنّہٗ لَا یُرَدُّ شَیْئًا وَ اِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِہٖ من البخیل رواہ الجماعۃ الا الترمذی و للجماعۃ اِلَّا ابا داؤد مِثْلَ معناہُ مِنْ رِوایۃ ابی ھریرۃ"

(نیل الاوطار۔ علامہ شوکانی جلد ۸ صفحہ ۲۴۹)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ حضور صلعم نے ہر قسم کی نذر ماننے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کسی چیز کو لوٹاتی نہیں صرف بخیل آدمی سے کچھ رقم نکلنے کا سبب ضرور ہے۔

اس حدیث کی حیثیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ یہ حدیث کی مشہور چھ صحیح کتابوں (صحاح ستہ) میں سے ترمذی کے سوا سب نے اسے روایت کیا ہے اور امام ابوداؤد نے اس کی تائید میں حضرت ابوہریرہؓ سے اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث بھی نقل کی ہے۔ مودودی صاحب دعوے تو یہ فرماتے ہیں کہ سنت قرآن کی تفسیر کرتی ہے۔ لیکن جس چیز سے حضور صلعم منع فرماتے ہیں اسے وہ اجر و ثواب کا موجب قرار دیتے ہیں اسے کہتے ہیں سنت سے عشق۔

قرآن و حدیث کے مطابق طلاق کا صحیح طریقہ

طلاق کے ناجائز استعمال نے جس طرح ہمارے معاشرہ کو خراب کیا ہے۔ خود مودودی صاحب کو اس کا احساس ہے کہ اس کے غلط استعمال نے ہمارے ۹۰ فی صد گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے۔ (بحوالہ حقوق الزوجین طبع ششم صفحہ ۹) چنانچہ وہ اپنی تفسیر میں قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اس کا صحیح طریقہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:-

"طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ عورت کو حالت طہر میں ایک مرتبہ طلاق دی جائے۔ اگر جھگڑا ایسے زمانے میں ہوا جبکہ عورت ایام ماہواری میں ہو تو اسی وقت طلاق دے بیٹھنا درست نہیں ہے۔ بلکہ ایام سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ پھر ایک طلاق دینے کے بعد اگر چاہے تو دوسرے طہر میں دوبارہ ایک طلاق اور دیدے۔ ورنہ بہتر یہی ہے کہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کرے۔ اس صورت میں شوہر کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے پہلے جب چاہے رجوع کرے۔ اور اگر عدت گزر بھی جائے تو دونوں کے لئے موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن تیسرے طہر میں تیسری بار طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی جائیں جیسا کہ آجکل جہلا کا عام طریقہ ہے تو یہ شریعت کی رو سے سخت گناہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا آپ اس کو درے لگاتے تھے۔ (صفحہ ۱۷۴)

آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے قرآن و حدیث کے مطابق طلاق کا صحیح طریقہ تو بیان فرما دیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں جو غلط طریقہ رواج پا گیا ہے اسے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں" (بحوالہ حقوق الزوجین۔ صفحہ ۱۵۵)۔

قیام پاکستان کے بعد حکومت کے لئے ممکن ہو گیا کہ وہ اس قسم کی پابندیاں لگائے۔ لیکن جونہی یہ پابندیاں نافذ کی گئیں اور طلاق ثلاثہ بیک مجلس کو خلاف قانون قرار دیدیا گیا تو مودودی صاحب کی سیاسی مجبوریوں نے انہیں مخالفت پر مجبور کر دیا۔ اور قارئین حیران ہوں گے کہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں طلاق کے جس طریقے کو قرآن و حدیث کے مطابق قرار دیا تھا یکایک اس کی مخالفت کرنے لگے اور اب قرآن و حدیث اور اپنی تفسیر کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی صحیح طریقہ کو حنفی فقہ کے خلاف قرار دیدیا۔ انہی کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں:-

قرآن و حدیث کے مطابق طلاق کا صحیح طریقہ حنفی مذہب کے خلاف ہے

"بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں تو اس سے طلاق مغلظ واقع ہو جاتی ہے۔ اور مطلقہ عورت سے اس کا سابقہ شوہر نہ تو مدت عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت گزر جانے کے بعد اس کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے جب تک کہ اس کی تحلیل نہ ہو جائے۔

۱ء حنفی فقہ کے مطابق اس کی تشریح آگے آتی ہے۔

اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد امام ابو حنیفہؒ اور مذہب حنفی کے ائمہ وفقہاء کے علم و تقویٰ پر ہے وہ اعتماد آجکل کے قانون سازوں پر نہیں ہے۔"

(بحوالہ عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات صفحہ ۱۰۰، ۱۹)

قارئین سوچتے ہوں گے کہ جس وقت مودودی صاحب نے تفہیم القرآن لکھی تھی اس وقت شاید ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی نہیں ہوگی کہ انہوں نے قرآن و حدیث کے مطابق طلاق کا صحیح طریقہ اپنی تفسیر میں بیان کر دیا تھا۔ نہیں یہ غلط فہمی بالکل نہیں ہونی چاہیئے۔ اس وقت بھی ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی تھی اور انہوں نے مودودی صاحب کی اس تفسیر پر اعتراض بھی کیا تھا۔ خیال رہے کہ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن پہلے قسط وار ان کے رسالے ترجمان القرآن میں شائع ہوتی رہی تھی۔ لیکن مودودی صاحب نے حنفی فقہ کی تضحیک کرتے ہوئے ان حنفی علماء کو جو ڈانٹ پلائی تھی وہ خود انہی کی زبانی سنیئے:۔

حنفی فقہ کی کتابوں کی تضحیک

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گناہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اس لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا۔ تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے مجرد کر کے اپنے اسلاف کی پیروی کرو۔ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں لکھا تھا تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے پیشرو انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔ اس بازپرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ، اور عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ مل سکے گی۔"

(حقوق الزوجین۔ صفحہ ۹۸)

لیکن سیاست بازی نے انہیں یہ دن دکھایا کہ وہ خود یہ نعرہ لگانے لگے کہ قرآن و حدیث کے مطابق طلاق کے صحیح طریقہ کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ کیونکہ یہ حنفی فقہ کے خلاف ہے اور ساتھ ہی حنفی فقہ کی انہی کتابوں کے مصنفوں کے دامن میں پناہ بھی لے لی جن کی وہ کسی زمانے میں تضحیک کر چکے تھے۔

تحلیل یا حلالہ

طلاق ثلاثہ بیک مجلس کا حنفی فقہ کے مطابق جواز تلاش کرتے ہوئے لفظ تحلیل کا بھی ذکر تھا جس کے متعلق ہم نے اشارہ کیا تھا کہ حنفی فقہ کے مطابق اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ یہ اسی "حلالہ" کا معصوم نام ہے جو طلاق ثلاثہ بیک مجلس کا فطری نتیجہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس پر جس گھناؤنے طریقے سے عمل ہو رہا ہے اکثر قارئین کو اس کا اندازہ ہوگا۔ یہ کوئی جاہل مولویوں کی کارروائی نہیں ہوتی تھی بلکہ حنفی مذہب کے جن فقہاء کے علم و تقویٰ کا واسطہ دے کر مودودی صاحب طلاق ثلاثہ بیک مجلس کا جواز پیش کرتے ہیں انہی کتابوں میں اس کا جواز ان الفاظ میں موجود ہے:۔

"وَ اِذَا تَزَوَّجَهَا بِشَرْطِ التَّحْلِيْلِ فَالنِّكَاحُ مَكْرُوْهٌ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَهُ وَ هٰذَا هُوَ مَحْمَلُهُ فَاِنْ طَلَّقَهَا بَعْدَ وَطْيِهَا حَلَّتْ لِلْاَوَّلِ لِوُجُوْدِ الدُّخُوْلِ فِيْ نِكَاحٍ صَحِيْحٍ"

(ہدایہ اولین مجیدی صفحہ ۳۷۷)

(فتح القدیر) یعنی اگر حلالہ کی شرط سے کسی عورت سے نکاح کیا تو یہ ایک مکروہ فعل ہے کیونکہ حضور صلعم نے حلالہ کرنے اور کرانے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے اور اس سے مراد یہی حلالہ ہے۔ تاہم اگر اس (حلالہ کے نکاح) کے بعد کوئی شخص عورت سے مباشرت کے بعد اسے طلاق دیدے۔ تو وہ پہلے طلاق دینے والے شخص کے لئے حلال ہو جائے گی کیونکہ دخول نکاح صحیح میں ہوا ہے۔

اب تفہیم القرآن کے مصنف حنفی فقہاء کے علم و تقویٰ کا واسطہ دیتے ہوئے اور ان کی کتابوں کے دامن میں پناہ لیتے ہوئے اسے جائز قرار دے رہے ہیں۔ اور بے چارے یہ بھول گئے کہ کسی زمانے میں وہ اپنی تفسیر میں اس بارے میں یہ بھی لکھ چکے ہیں:-

"احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے لئے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرے کہ وہ نکاح کے بعد اسے طلاق دے دیگا تو یہ سراسر ایک ناجائز فعل ہے۔ ایسا نکاح، نکاح نہ ہوگا بلکہ محض ایک بدکاری ہوگی اور ایسے سازشی نکاح و طلاق سے عورت ہرگز اپنے شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی۔ حضرت علی، اور ابن مسعود، اور ابو ہریرہ اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم کی متفقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ سے حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔"

(تفہیم القرآن جلد اول طبع سوم - صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷)۔

سود فوجداری جرم ہے

سود کی حرمت پر بحث کرتے ہوئے اپنی تفسیر کے صفحہ ۲۱۰ پر اسے فوجداری جرم قرار دیا ہے اور اس کی حرمت پر عقلی دلائل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت، اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی شریک کی نہیں ہوتی جو نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعویدار ہوتا ہے۔"　(صفحہ ۲۱۳)

سود اور منافع کا فرق کیسے شاندار اور بچے تلے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو یہاں بھی مودودی صاحب طلاق ثلاثہ بیک مجلس کی طرح خود اپنی تفسیر کے خلاف راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سود صرف وہی کچھ ہے جو بنکوں میں لیا دیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر اسی رقم مثلاً دس ہزار روپے کو بنک میں جمع کرانے کی بجائے اس سے کوئی اراضی وغیرہ خرید کر کسی دوسرے کو بٹائی پر دیدے اور پھر گھر بیٹھے بلا کسی محنت و مشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جائے تو یہ ان کے نزدیک اس حد تک جائز ہو جاتا ہے کہ جو اہل علم اسے ناجائز سمجھتے ہیں ان کا منہ بند کرنے کے لئے ایک پوری کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" تصنیف فرماتے ہیں، اب زمین کی بٹائی جو خود مودودی صاحب کی سود کی تعریف کے مطابق سود ہی قرار پاتی ہے کوئی نیا مسئلہ تو تھی نہیں صدر اسلام میں اس کا وجود تھا اور خود رسول اللہ صلعم نے اسے سود قرار دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو سنن ابو داؤد۔ مطبوعہ مصر - جلد ۲ صفحہ ۳۵۵)۔ بلکہ آپ نے تو یہاں تک تنذیر فرمائی تھی کہ جو بٹائی کو چھوڑنے پر تیار نہ ہو وہ اللہ اور اس کے رسول سے ساتھ لڑائی کے لئے تیار ہو جائے۔ (من لم یذر المخابرۃ فلیاذن

بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ (البقرۃ) خیال رہے کہ قرآن مجید میں سود کی حرمت کے لئے یہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں لیکن مودودی صاحب تو عاشقِ رسولؐ ہیں۔ آخر انہیں اس عشق کا اتنا فائدہ تو ہونا چاہیئے کہ وہ حضور صلعم کی سود قرار دی ہوئی ایک دو چیزوں کو جائز قرار دے سکیں۔

رہن اور سود

تفہیم القرآن میں سود کی بحث کے آخر میں ایک ایسا معاملہ بھی آجاتا ہے جو زمین کی بٹائی یا مکان کے کرایہ سے کمتر حیثیت کا ہے یعنی رہن شدہ مکان سے فائدہ حاصل کرنا۔ اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"اگر کوئی شخص رہن لئے ہوئے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ کھاتا ہے تو درحقیقت سود کھاتا ہے۔ قرض پر براہ راست سود لینے اور رہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اصولاً کوئی فرق نہیں۔" (صفحہ ۲۲۲)

جزاک اللہ۔ آخر بنک کے سود کے علاوہ کسی دوسری صورت کو مودودی صاحب نے سود قرار دے ہی دیا لیکن اگر وہ ذرہ بھر خیال کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جس معاملہ کو بھی سود قرار دے رہے ہیں وہ زمین کی بٹائی اور مکان کے کرایہ سے ہلکا ظلم ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کا دس ہزار روپے کا مکان پانچ سال کے لئے رہن رکھتا ہے۔ تو اس کے لئے اس مکان سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا حرام ہے۔ اور پانچ سال بعد جب اسے اپنی رقم ملے گی تو اس کی دس پندرہ فی صد بازاری قیمت کم ہو چکی ہوگی۔ لیکن اگر وہ صاحب دس ہزار میں کوئی مکان خرید لیتا ہے اور ایک سو روپے ماہوار کرایہ پر اٹھا کر پانچ سال میں گھر بیٹھے بغیر کسی محنت و مشقت کے صرف سرمایہ کے زور پر چھ ہزار روپے کرایہ وصول کر لیتا ہے۔ تو وہ کیسے جائز ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ صاحب بغیر کسی محنت و مشقت کے نہ صرف کرائے کی صورت میں اتنی بڑی رقم وصول کر لیں گے بلکہ اس عرصے میں ان کے مکان کی بازاری قیمت میں بھی دس پندرہ فی صد اضافہ ہو چکا ہوگا۔ کیسی شاندار قرآنی فکر ہے۔ کہ اس رقم پر ہزار ڈیڑھ ہزار کا خسارہ ہو جائے تو اس سے فائدہ حاصل کرنا سود لہٰذا حرام لیکن اگر اس سے گھر بیٹھے بغیر کسی محنت و مشقت کے سات آٹھ ہزار کا فائدہ حاصل کر لیا جائے تو جائز۔ اور اسے سود قرار دینے والے کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر اور جائز قرار دینے والا مفکرِ اسلام۔

نکاح ایک معاہدہ ہے

وَ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا (اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"پختہ عہد سے مراد نکاح ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت میں ایک مضبوط پیمان وفا ہے۔ جس کے استحکام پر بھروسہ کر کے ہی ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ کرتی ہے۔ اب اگر مرد اپنی خواہش سے اس کو توڑتا ہے تو اسے وہ معاوضہ لینے کا حق نہیں ہے جو اس نے معاہدہ کرتے وقت پیش کیا تھا۔" (صفحہ ۳۳۵)

اب قانوناً نابالغ کا معاہدہ چونکہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور کوئی عورت اس کے استحکام پر بھروسہ نہیں کر سکتی اس لئے قرآن مجید کی رو سے نابالغ کا نکاح صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ صغر سنی کی شادی کی مخالفت کرتے ہوئے صاحب تفہیم القرآن نے فرمایا:۔

"اس بات کی سخت ضرورت ہے۔ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے۔ کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتداء میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں آگے چل کر سخت بداخلاقیوں، بُری عادتوں اور فاسد

(اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔" (حقوق الزوجین صفحہ ۱۱۹)

مال نابالغ کے سپرد نہ کیا جائے

ان کے اس مسلک کی تائید ان کی اس تفسیر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے "وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ" (اور یتیموں کو آزماؤ یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں) کے ذیل میں فرمائی ہے:۔

"مال ان کے حوالہ کرنے کے لئے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں۔ ایک بلوغ دوسرے رشد یعنی مال کے صحیح استعمال کی اہلیت۔ پہلی شرط کے متعلق تو فقہائے امت میں اتفاق ہے۔ دوسری شرط کے بارے میں امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ اگر سن بلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رشد نہ پایا جائے (تو) ولی یتیم کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیئے پھر خواہ رشد پایا جائے یا نہ پایا جائے اس کا مال اس کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ اور امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ مال حوالہ کئے جانے کے لئے بہر حال رشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔" (صفحہ ۳۲۳)۔

مودودی صاحب کی اس تفسیر کی روشنی میں ہر سلیم الفطرت آدمی یہ حقیقت بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ کہ شریعت اسلامی جب چند دنوں میں فنا ہو جانے والے مال کے بارے میں اس قدر محتاط ہے۔ کہ جب تک اس کا مالک بالغ اور اس کے استعمال کا اہل نہ ہو جائے اس کے حوالے نہ کیا جائے تو وہ کس طرح یہ اجازت دے سکتی ہے۔ کہ کسی عورت کو ایسے نابالغ کے حوالے کیا جائے۔ جس کے ساتھ اس نے ساری عمر گزارنی ہے

لیکن جب حکومت نے مودودی صاحب کی اس تفسیر کے مطابق صغرسنی کی شادی پر کچھ پابندیاں عائد کیں تو مودودی صاحب بھڑک اٹھے اور ان پابندیوں کو خلاف قرآن قرار دے دیا اب ان کا فرمانا یہ تھا کہ

"یہ قرآن کے صریح حکم کے خلاف اور ان مصالح سے متصادم ہے جنہیں شریعت نے اہمیت دی ہے قرآن مجید میں بالفاظ صریح ایسی لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا جس کو ابھی تک حیض نہ آیا ہو۔"

(عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۹)

مودودی صاحب کا یہ دعویٰ سامنے آتے ہی ہم حیران ہو گئے کہ یا الٰہی یہ الفاظ تفہیم القرآن کے مصنف کی زبان سے نکل رہے ہیں کہ جن کی تفسیر کے مطابق صغرسنی کا نکاح ہی جائز قرار نہیں پاتا قرآن کی آیت وَ الّٰٓـِٔىْ لَمْ يَحِضْنَ کے جو معنی یعنی جس کو ابھی تک حیض نہ آیا ہو" بھی ہمارے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اس مطلب کے لئے ہم نے قرآن مجید کے موجود تمام ترجمے دیکھے ان تمام میں اس آیت کے ایک ہی معنی دیئے ہوئے تھے "کہ جن عورتوں کو حیض نہ آسکا ہو"۔ مودودی صاحب نے حکومت کی مخالفت میں اپنی تفسیر سے تو منہ موڑا ہی تھا لیکن ساتھ ہی اس آیت کے صحیح معانی پر بھی ہاتھ صاف کر ڈالا۔

وفات ٹیکس

مسئلہ وراثت کی تفسیر کے سلسلے میں فرماتے ہیں:۔

"اور اب ان پرانی بغاوتوں کے ساتھ تازہ ترین بغاوت یہ ہے۔ کہ بعض مسلمان ریاستیں اہل مغرب کی تقلید میں "وفات ٹیکس" (DEATH DUTY) اپنے ہاں رائج کر رہی ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ میت کے وارثوں میں ایک وارث حکومت بھی ہے۔ جس کا حصہ رکھنا اللہ میاں بھول گئے تھے" (صفحہ ۳۳۱)

محترم مفسر کو واضح کرنا چاہیئے تھا کہ جب وہ اسلامی ریاست میں دوسرے ٹیکس لگانے کی اجازت دیتے ہیں

تو ان میں آخر وفات ٹیکس (DEATH DUTY) کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں؟ لیکن اس کے لیے آپ نے کوئی دلیل نہیں دی۔ حالانکہ اسلامی ریاست میں دوسرے ٹیکسوں کی شرعی بنیاد تو نہیں ملتی لیکن وفات ٹیکس کی کسی حد تک مل جاتی ہے۔ خیال رہے کہ اس ٹیکس کا اطلاق لاکھوں والی جائیداد پر ہوتا ہے۔ اور اسلام سرے سے یہ چاہتا ہی نہیں کہ کوئی مسلمان اتنی بڑی جائیداد چھوڑ جائے۔ حضور صلعم کا فرمان ہے کہ مَنْ تَرَكَ عَشَرَةَ اٰلَافِ دِرْهَمٍ جُعِلَتْ صَفَائِحَ يُعَذَّبُ بِهَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (احکام القرآن - الجصاص - جلد ۳ صفحہ ۱۲۲) کہ جس نے ترکے میں دس ہزار درہم چھوڑے وہ اس کے لئے چوڑے پتھر بنا دیئے جائیں گے جن سے قیامت کے دن اسے سخت عذاب دیا جائے گا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم پھر اصل مطلب کی طرف آتے ہیں۔ حضور صلعم نے جو دولت پر یہ حد لگائی تو آپ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی مسلمان بغیر محنت کے اتنی بڑی دولت کا مالک یا وارث بن جائے اور اسے عیش و عشرت میں اڑا دے۔ چنانچہ آپ نے اپنے دوسرے فرمان میں ایسے لوگوں کو بدترین انسان قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو

"شرار امتی ولدوا فی النعیم و غذوا بہ یاکلون من الطعام الوانا ویلبسون من الثیاب الوانا ویرکبون من الدواب الوانا ویتشدقون فی الکلام"

(ترجمہ) میری امت کے بدترین افراد وہ ہیں جو نعمتوں کی گود میں پیدا ہوئے ہیں اور اسی میں پروان چڑھے قسم قسم کے کھانے کھاتے ہیں، طرح طرح کے لباس پہنتے ہیں۔ قسم قسم کی سواریاں (یعنی نئے نئے ماڈل کی کاریں) استعمال کرتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں۔ (یہ حدیث الحاکم اور مستدرک میں عبداللہ بن جعفر کی روایت سے منقول ہے اور شعب الایمان میں امام بیہقی نے حضرت فاطمۃ الزہرا بنت الرسول صلعم کی زبانی اسے تھوڑے سے لفظی اختلاف سے بیان کیا ہے۔

حضور صلعم کے ان ارشادات کی روشنی میں ہمارے خیال میں تو آپ کی مقرر کردہ حد سے جتنی رقم بھی زیادہ ہو وہ اسلامی حکومت اپنے تصرف میں لے لے۔ اس سے ایک تو صاحبِ مال عذاب سے بچ جائے گا اور دوسرے امت میں بدترین افراد کے پنپنے کا امکان کم ہوتا جائے گا۔

لونڈیوں سے تمتع

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگی قیدیوں کے سلسلے میں قرآن کے آخری احکام کہ یا تو انہیں قیدیوں کے بدلے یا بطور احسان رہا کر دو۔ مودودی صاحب کے سامنے نہیں۔ معلوم نہیں وہ اس واضح قرآنی حکم کی کیا تاویل کرتے ہیں کہ اس کے مخالف جنگ میں دشمن کی پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کی کھلی اجازت دیتے ہیں فرماتے ہیں:-

"جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہلِ کتاب ہی میں سے ہوں، ان کا مذہب خواہ کوئی ہو۔ بہر حال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصہ میں وہ آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں" (صفحہ ۳۴۰)

اس موضوع پر اگرچہ مولانا نے اپنی تفہیم القرآن میں سب سے زیادہ لمبی بحث کی ہے لیکن اختصار کے مدنظر ہم ان کا صرف ایک اور اقتباس نقل کرتے ہیں:-

"جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد پر چار کی پابندی لگائی ہے۔ اسی طرح لونڈیوں کی تعداد پر نہیں لگائی۔ لیکن اس معاملے میں کوئی حد مقرر نہ کرنے سے شریعت کا منشا یہ نہیں تھا کہ مال دار لوگ بے شمار لونڈیاں خرید خرید کر

جمع کرلیں اور اپنے گھر کو عیاشی کا گھر بنالیں۔ بلکہ درحقیقت اس معاملہ میں عدم تعین کی وجہ جنگی حالات کا عدم تعین تھا۔"

لونڈی سے نکاح کا قرآنی حکم

مودودی صاحب تو بغیر نکاح کے لونڈی سے تمتع کی اجازت دے رہے ہیں۔ لیکن قرآن مجید ان سے نکاح کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ مثلاً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے ذیل میں خود تفہیم القرآن کے مصنف فرماتے ہیں "یا اُن عورتوں کو زوجیت میں لاؤ جو تمہارے قبضہ میں آئی ہیں" (صفحہ ۳۲۱)۔ یہ آیت اپنی لونڈی سے بغیر نکاح کے مباشرت کو واضح طور پر ناجائز قرار دے رہی ہے۔

اور آگے چلیئے۔ لونڈی سے نکاح کے قرآنی حکم کے سلسلے میں ایک دوسرے مقام پر فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ یعنی خاندانی عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو کسی لونڈی سے اس کے مالکوں کی اجازت سے کر نکاح کر لینے کی سہولت (۳۴۳)۔

بعض اوقات مودودی صاحب بھی بڑی سادہ لوحی سے کام لیتے ہیں۔ جب وہ ان لونڈیوں کو بغیر نکاح کے مالکوں کی بیویاں قرار دے چکے ہیں تو کونسا ایسا بے وقوف مالک ہوگا کہ جو اپنی بیویوں کا دوسروں سے نکاح کی اجازت دے گا۔ اور خود کو مودودی صاحب کی عطا کردہ "تمتع کی نعمت" سے محروم کرے گا۔

لونڈیاں دورِ ملوکیت کا تحفہ ہیں

لونڈیاں دورِ ملوکیت کا تحفہ ہیں۔ اور دنیادار علماء نے بادشاہوں کی خواہشات کے مطابق فتوے دیدیئے تھے اور حد یہ ہے کہ آج بھی جن مسلمان ممالک میں ملوکیت کی جڑیں مضبوط ہیں ان میں اس کا رواج ہے۔ ان میں سے ایک ملک سعودی عرب بتایا جاتا تھا۔ چنانچہ مودودی صاحب جب ارض القرآن کے سفر پر نکلے تو بنفس نفیس اس کی تحقیق کی۔ انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:-

"سعودی عرب میں بھی اس زمانہ میں غلاموں اور لونڈیوں کا رواج ہے۔ شیخ عفیفی نے بتایا کہ یہاں جو غلام اور لونڈیاں آتی ہیں وہ یا تو مسقط اور عمان کی طرف سے آتی ہیں یا لبنان کی طرف سے۔ ان کے جواز کی وجہ صرف یہ بیان کی جاتی ہے کہ غلام یا لونڈی آکر کہتی ہے کہ میں لونڈی ہوں، اور میرے آباؤ اجداد قدیم زمانے سے غلام چلے آتے ہیں، اس کے صرف اس بیان پر اسے خرید لیا جاتا ہے۔ اور اس کے لانے والے سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ وہ اسے کیسے لایا ہے۔ وہ اسے لالچ دے کر بھی لاسکتا ہے ڈرا کر بھی لاسکتا ہے اور اس کے ماں باپ سے خرید کر بھی لاسکتا ہے۔ ہاں اگر لونڈی یا غلام کہہ دے کہ مجھے زبردستی لونڈی یا غلام بنایا گیا ہے تو اسے آزاد کر دیا جاتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ آخر وہ یہ بات کہہ کیسے سکتی ہے۔ آزاد ہو کر وہ تنہا جائے گی کہاں؟ اس پر شیخ عفیفی خاموش ہو گئے۔ انہوں نے پھر بتایا کہ لونڈیوں کے جواز پر بعض لوگ فقہاء کی کتابوں سے یہ مسئلہ بھی نکالتے ہیں کہ کافر کو فروخت کیا جاسکتا ہے۔ کافر خود بھی اپنے آپ کو فروخت کر سکتا ہے۔ اور اپنے بیٹے یا بیٹی کو بھی فروخت کر سکتا ہے۔ لہٰذا اُسے یا اس کے بیٹے بیٹی کو خرید جا سکتا ہے گویا الابلا بر سرِ ملا والا معاملہ ہے۔" (سفرنامہ ارض القرآن صفحہ ۱۱۴)

سعودی حکومت کے اسلامی ہونے پر مولانا کا خراجِ تحسین

لونڈیاں بنانے کا یہ طریقہ خود مودودی صاحب کی تفسیر کے بھی خلاف تھا۔ اس لئے قارئین منتظر ہوں گے کہ شاید مودودی صاحب نے اس کی مذمت کی ہو۔ حاشا و کلا آپ نے تو بلکہ اس حکومت کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ وہ دنیا کی واحد اسلامی حکومت ہے۔ اپنے دورہ کے آخر میں آپ نے سعودی عرب والوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا اور

"اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ یہاں ایسی حکومت قائم ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو اپنے فرائض میں شمار کرتی ہے۔ آپ کے اس علاقے کے سوا دنیا میں کوئی مسلمان حکومت بھی ایسی نہیں جو اپنے فرائض میں اس چیز کو شمار کرتی ہو۔" (صفحہ ۱۸۱)

مودودی صاحب کا یہ سفرنامہ اگست ستمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ٹھیک انہی دنوں جب یہ مارکیٹ میں آیا تو جماعت اسلامی کے ترجمان سہ روزہ ایشیا نے اپنی ۹ دسمبر ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں سعودی عرب کی حکومت کو مثیل خلافت راشدہ قرار دیدیا (مقرر قول) شکر ہے کہ مودودی صاحب کے یہ لاثانی افکار کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ نہیں ہوئے وگرنہ ہندوستان میں اس وقت مجبور ہماری بہنوں پر اس کا بدترین اثر پڑتا۔ تفہیم القرآن کے صفحہ ۳۲۲ پر فرماتے ہیں:-

تعدد ازدواج

"جن لوگوں کے نزدیک تعدد ازدواج فی نفسہٖ ایک برائی ہے ان کو یہ اختیار تو ضرور حاصل ہے کہ چاہیں تو قرآن کے برخلاف اس کی مذمت کریں۔ اور اسے موقوف کر دینے کا مشورہ دیں۔ لیکن یہ حق انہیں نہیں پہنچتا کہ اپنی رائے کو خواہ مخواہ قرآن کی طرف منسوب کریں۔ کیونکہ قرآن نے صریح الفاظ میں اس کی اجازت دی ہے اور اشارۃً وکنایۃً بھی اس کی مذمت میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ فی الواقع وہ اسے مسدود کرنا چاہتا تھا۔" (صفحہ ۳۲۲) مفسرین نے اس آیت (پ ۴) میں النساء سے عام طور پر یتیم لڑکیاں مراد لی ہیں (تفسیر روح المعانی جلد ۴ صفحہ ۱۷۳) اور بعض ائمہ تفسیر نے اس کی روشنی میں تین امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی تحدید ازدواج اور صرف ایک بیوی تک محدود رہنا یا لونڈی سے نکاح کرنا (ایضاً صفحہ ۱۷۵)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تعدد ازدواج تو کسی ایک عورت سے شادی کے مقابلے میں بھی نفلی عبادت میں مشغول رہنے کو زیادہ افضل قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۰۳) اور آپ کے استدلال کو امام فخر الدین رازی صاحب تفسیر کبیر اور علامہ آلوسی صاحب نے تفسیر روح المعانی میں صحیح تسلیم کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خان صاحب اپنی مشہور تفسیر فتح البیان جلد ۲ صفحہ ۱۹۶ پر فرماتے ہیں کہ تعدد ازدواج کا مسئلہ قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا پس زیادہ صحیح یہ ہے کہ حدیث سے استدلال کیا جائے۔ اور اس مطلب کے لئے جو احادیث پیش کی جاتی ہیں امام شوکانی ان کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (نیل الاوطار جلد ۶ صفحہ ۱۵۰)

علامہ مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی کتاب حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی (مطبوعہ کراچی طبع اول) کے صفحہ ۱۷۱ پر ثابت کیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ شرعی اجازت کو ایک ہی بیوی تک محدود سمجھتے تھے اور پھر مودودی صاحب جیسے مفسر قرآن حضرات کو یہ تنبیہ کی ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں یورپ کی نکتہ چینیوں کے بعد مسلمانوں نے بنانی شروع کی ہیں، ان کا بہترین جواب امام صاحب کا یہ بیان ہو سکتا ہے۔" امام احمد بن حنبل صرف ایک عورت سے شادی کرنا مستحب سمجھتے تھے کہ تعدد ازدواج سے حرام میں پڑ جانے کا خطرہ ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ صفحہ ۱۰)

خیر یہ تو ائمہ تفسیر اور ائمہ فقہ کے فیصلے تھے۔ خود حضور صلعم کا فیصلہ اس بارے میں قول فیصل ہے۔ جبکہ آپ نے منبر نبوی پر رونق افروز ہو کر حضرت فاطمہؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ دی تھی۔ (بحوالہ بخاری۔ باب ذب الرجل عن ابنتہ فی الغیرۃ والانصاف)

اب اس کے مقابلے میں ایک دفعہ پھر مودودی صاحب کی تفسیر پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان کے طعن کے تیر کہاں کہاں جا کر پڑتے ہیں۔

شیطان کے شاگرد

تفہیم القرآن کے صفحہ ۳۹۹ پر فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰہِ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

- اس جگہ جس ردوبدل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے جس کے لئے خدا نے اسے پیدا نہیں کیا ہے۔ اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ تمام افعال جو انسان اپنی اور اشیاء کی فطرت کے خلاف کرتا ہے اور وہ تمام صورتیں جو وہ منشائے فطرت سے گریز کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس آیت کی رو سے شیطان کی گمراہ کن تحریکات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً عملِ قومِ لوط، ضبطِ ولادت، رہبانیت، برہمچرج، مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا، مردوں کو خواجہ سرا بنانا، عورتوں کو ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سپرد کی ہیں اور انہیں تمدن کے ان شعبوں میں گھسیٹ لانا جن کے لئے مرد پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار افعال جو شیطان کے شاگرد دنیا میں کر رہے ہیں۔ دراصل یہ معنی رکھتے ہیں کہ یہ لوگ خالقِ کائنات کے ٹھیرائے ہوئے توانین کو غلط سمجھتے ہیں اور ان میں اصلاح فرمانا چاہتے ہیں۔" مسٹر اے۔ کے بروہی جن کی تعریف سے ابتدا کر کے تفہیم القرآن کی عظمت بیان کی جاتی

عورتوں کے بنیادی حقوق

ہے "اقوامِ متحدہ میں" انسان کے بنیادی حقوق "کے سلسلے میں کام کرتے رہے ہیں جس کے نتیجے میں عورت کو ہر ملک میں مردوں کے مساوی مواقع فراہم کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ خود جماعتِ اسلامی والے بھی ان کے اس کارنامے کا ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح سے وہ بھی عورتوں کو تمدن کے ان شعبوں میں گھسیٹ لانے کے مرتکب ہوئے ہیں جو مرد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اور مودودی صاحب کے اس شاندار لقب "یعنی شیطان کے شاگرد" کے بطریقِ اولیٰ مستحق قرار پاتے ہیں۔ کیا فرماتے ہیں جناب بروہی اس کے متعلق!

ہر حکومت کی طرح جماعتِ اسلامی والوں کو موجودہ حکومت سے بھی بغض ہے۔ موجودہ حکومت نے شاید اقوامِ متحدہ کی انسانی حقوق کی ان سفارشات کی روشنی میں جنہیں جناب اے۔ کے۔ بروہی صاحب مرتب کرتے رہے تھے پاکستان میں بھی عورتوں کے لئے کام کرنے کے مساوی مواقع فراہم کر دیئے ہیں اور اب وہ اپنی قابلیت کی بنا پر مقابلے کے ذریعے ملک کے اعلیٰ انتظامی عہدے حاصل کر سکتی ہیں اور کر رہی ہیں۔ جماعتِ اسلامی والے ان بنیادی حقوق کو خلافِ اسلام سمجھتے ہیں اور بار بار تفہیم القرآن سے مودودی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں ایسا کرنے والوں کو "شیطان کے شاگرد" قرار دیا گیا ہے۔

ان کے اس فتوے کی تفصیل کے لئے اگر انہی کی زبانی ذرا تفصیل بیان کر دی جائے تو قارئین کو اس مسئلے کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ قیامِ پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی میں آئین کا مسئلہ زیرِ غور آیا تو مودودی صاحب نے بھی اپنی "دستوری تجاویز" پیش کی تھیں۔ ان میں ایک شق یہ بھی تھی:۔

"مجالسِ دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے، اسلام کے اصول اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظامِ ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے۔ اور یہ فرائض عورتوں کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں۔"

عقلی دلیل مانگنے والوں کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر ہے

مودودی صاحب کی مذکورہ بالا تجویز پر اہلِ علم حضرات کی طرف سے اعتراض ہوئے۔ تو آپ نے اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں ان اعتراضات کا تفصیلی جواب دیا اور بزعمِ خود قرآن و حدیث سے ثابت کیا کہ عورتوں کے لئے ملکی انتظامات میں حصہ لینا قطعاً جائز نہیں اور آخر میں لکھا کہ:۔

"اگرچہ ہمارے پاس اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں مضبوط عقلی دلائل بھی ہیں اور کوئی چیلنج کرے تو ہم انہیں پیش کر سکتے ہیں،

مگر اول تو ان کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا دوسرے ہم کسی مسلمان کا یہ حق ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے واضح احکام سننے کے بعد ان کی تعمیل کرنے سے پہلے اور تعمیل کے لئے شرط کے طور پر عقلی دلائل کا مطالبہ کرے۔ تعمیل حکم کے لئے عقلی دلائل مانگنے والے کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر ہے۔ نہ کہ اس کے اندر۔"

اپنے کیوں محروم رہیں

مودودی صاحب نے مذکورہ بالا مسائل میں اختلاف رکھنے والوں کو جو اپنی تفسیر میں "شیطان کے شاگرد" کے لقب سے نوازا تو شاید بعد میں انہیں خیال آیا کہ یہ لقب تفہیم القرآن میں استعمال ہونے سے پاک ہو گیا ہے۔ اس لئے اپنے بھی اس سے کیوں محروم رہیں۔ چنانچہ وہ اس کے لئے موقع کی تلاش میں رہنے لگے اور وہ موقع انہیں جلد ہی میسر آ گیا یہ موقع محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحوم) کا بطور امیدوار کھڑے ہونا تھا۔ اب دیکھئے کس طرح درجہ بدرجہ اس مقام تک پہنچتے ہیں۔ پہلے تو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی جانب سے یہ کہلوایا:۔

"جب یہ مرحلہ آیا تو ہم اس پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہو گئے کہ چار جماعتوں نے محترمہ مس فاطمہ جناح کو منتخب کرنے پر اتفاق کر لیا ہے۔ جسے قبول کرنا ان شرعی احکام کی موجودگی میں ہمارے لئے مشکل تھا جن کی رو سے کوئی عورت مسلمانوں کی امیر نہیں ہو سکتی۔"

باہر جماعت اسلامی والے اس فیصلے کے پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے۔ ادھر درون خانہ کچھ مزید کھچڑی پک رہی تھی۔ اور دو تین دن کے بعد یہ بات ابھر آئی کہ جماعت اسلامی محترمہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کرے گی۔ جب یہ اعتراض کیا گیا کہ اس سے پہلے مودودی صاحب خود اسے ناجائز قرار دے چکے ہیں تو مودودی صاحب نے جو کچھ فرمایا اسے روزنامہ مشرق نے اپنی ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں درج کیا تھا:۔

"اپوزیشن کی صدارتی انتخاب کی امیدوار محترمہ مس فاطمہ جناح پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے چیلنج کیا ہے کہ کوئی شخص یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شرع عورت کا سربراہ مملکت ہونا قطعی حرام ہے۔ اور اس سلسلے میں استثناء کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ انہوں نے کہا حکومت لوگوں کو مذہب کے نام پر گمراہ کر رہی ہے۔"

کہاں ملک کے معمولی انتظامی عہدوں کو عورتوں کے سپرد کرنے والوں کو "شیطان کے شاگرد" قرار دیا جا رہا تھا۔ اور کہاں انہوں نے ملک کے سب سے اعلیٰ انتظامی اور سیاسی عہدہ ایک عورت کو دلوانے کے لئے تن من دھن سے کوشش شروع کر دی۔ اور یوں اپنے مخالفوں کو عطا کردہ لقب کے بدرجہ اولیٰ مستحق ہو گئے۔

ضبطِ ولادت کو جائز قرار دینے والے شیطان کے شاگرد

یہاں تک تو خیریت تھی کہ ایک حکم جسے شاید سیاسی مصلحت کی بنا پر مودودی صاحب نے قرآن و سنت کی رو سے حرام قرار دیا تھا پھر کسی دوسری سیاسی مصلحت کی بنا پر اسے جائز قرار دے دیا تھا اور جو شاندار لقب "یعنی شیطان کے شاگرد" قرآن کی تفسیر جیسی سنجیدہ کتاب میں اپنے مخالفوں کو عنایت کیا تھا اس کے بدرجہ اولیٰ خود بھی مستحق ہو گئے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے۔ کہ انہوں نے اپنی تفہیم القرآن میں ضبطِ ولادت کو جائز قرار دینے والے تمام علمائے اسلام کو بھی اسی زمرے میں شمار کر دیا ہے۔ دراصل مودودی صاحب کی اس اہم انسانی مسئلہ کی مخالفت ان کا جذبہ انانیت ہے۔ اس اہم مسئلہ پر بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان کے مخالف عالم دین مولانا ابوالکلام آزاد جن کی شہرت بہر حال ان سے زیادہ تھی نے ضبط ولادت کے جواز کا فتویٰ دے دیا (ملاحظہ ہو ماہنامہ الحکیم بابت نومبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۲۹) اب بے چارے مودودی صاحب کے لئے مخالفت کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ اور اس طرح مخالفت کرکے اور ابوالکلام آزاد

کو شیطان کا شاگرد بنا کر اپنی انانیت کی تسکین کر لی، لیکن انہیں خیال نہ رہا کہ ان کے اس حملے کی زد صرف مولانا ابوالکلام آزاد پر ہی نہیں پڑے گی بلکہ بہت سے سلف صالحین اور علمائے خلف بھی اس کی زد میں آجائیں گے۔ مثلاً امام ابن قیم کی تحقیق کے مطابق احادیث سے اس کا جواز ثابت ہے، اور بہت سے صحابہ سے اس کا جواز منقول ہے۔ (زاد المعاد جلد ۴ صفحہ ۲۰) اسلامی فقہ کے چاروں ائمہ اسے بیوی کی اجازت سے جائز قرار دیتے ہیں (مختصر الفتاوی المصریہ صفحہ ۱۴۴) اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے۔ (زاد المعاد جلد ۴ صفحہ ۲۰) مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص جو مشہور صحابی رسولؐ تھے، انہوں نے جب مصر میں کثرت آبادی دیکھی تو انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے کی تلقین کی وغیرہ وغیرہ۔

مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا

مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانے والوں کو بھی "شیطان کے شاگرد" قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی دراصل خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے کا ایک طریق ہے۔ اور بعض علمائے دین نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اس بارے میں مودودی صاحب کے حملے کی پہلی زد تو برصغیر کے مشہور عالم دین حضرت صاحب الفضیلۃ مولانا مفتی سید عبدالامام صاحب الجلالی حنفی، مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی، اور آج کے ساتھی علماء پر پڑتی ہے جنہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ نسبندی (یعنی مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا) اضاعت حیات نہیں، اختصار نہیں، قتل نفس نہیں، تقلیلِ نسل کی پائیدار اور دوامی کوشش ہے۔ آپ اس کو ارادی تعقیم کہہ سکتے ہیں، جو بہ رضائے فریقین وجوہ شرعیہ کے تحت جائز ہے۔ والعلم عند اللہ (مسئلہ ضبط ولادت مطبوعہ دہلی صفحہ ۵۵)۔

اولاد کی خواہش کرنے والے بھی شیطان کے شاگرد ہیں

علمائے مصر نے بانجھ پن کے لئے قرآن مجید کی آیت وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيمًا سے استدلال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو اپنی حکمت سے بانجھ کر دیتا ہے تو پھر کسی مصلحت کے لئے بھی بانجھ بنا دینا جائز ہے (بحوالہ الدین وتنظیم الاسرۃ تالیف احمد الشرباصی مطبوعہ مصر صفحہ ۸۶)۔ اب اگر مودودی صاحب کی فکر کے مطابق بانجھ پن کو غیر فطرتی عمل شمار کیا جاتا ہے تو اس آیت کی رو سے نعوذ باللہ من ذالک اس کی زد قرآن شریف پر پڑتی ہے اور اگر بانجھ پن کو فطرتی عمل شمار کیا جاتا ہے۔ تو پھر اولاد کی خواہش کرنے والے جو اسے علاج معالجے سے دور کرتے ہیں اور نوے فی صد حالتوں میں اس کا علاج ممکن ہے۔ تو وہ بھی شیطان کے شاگرد قرار پاتے ہیں۔

”خدائی دربار“ کے درباری

یہ ہے وہ شاندار حل جو مودودی صاحب نے اپنے دور کے مسائل کا قرآن مجید کی روشنی میں پیش کیا ہے اور جن کے لئے تفاسیر کے ذخیرے میں ان کی تفہیم القرآن کے اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جیسا کہ قارئین نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ اس میں بعض چیزیں ایسی آگئی ہیں جنہیں ایک ذوق سلیم برداشت تک نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ کہ ملک کا اعلیٰ قانونی دماغ اس کی شان میں قصیدہ کہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ملک کا اعلیٰ قانونی دماغ ذوقِ سلیم سے محروم ہو۔ اس لئے راقم نے یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ مسٹر اے۔ کے بروہی نے تفہیم القرآن کا مطلق مطالعہ نہیں کیا۔

اس کی تعریف تو صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جن کے ذہن اس حد تک مفلوج ہو چکے ہوں۔ کہ ان کے سامنے شریعت کے احکام کو اس طرح بدلا جائے کہ جس طرح گرگٹ رنگ بدلتی ہے اور ان کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلے۔ یہ (معاذ اللہ) ایک ”خدائی دربار“ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا علم وہیں تک محدود ہے کہ جہاں تک مودودی صاحب فرمائیں۔ اور سب درباری یک زبان ہو کر جواب دیں۔ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ مثلاً مودودی صاحب اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

یہ ٹھیک ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نذر ماننے سے منع فرمایا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ نہیں یہ اجر و ثواب کا موجب ہے۔ تو اس دربار کے سب درباری یک زبان ہو کر فرماتے ہیں کہ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ مودودی صاحب ایک دفعہ فرماتے ہیں کہ طلاق ثلاثہ بیک مجلس قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ سب درباری کہتے ہیں ٹھیک۔ کچھ عرصے کے بعد فرماتے ہیں کہ نہیں بھی وہ تو قرآن و سنت کے مطابق ہے اور جو اسے ختم کرے گا ہم اس کے خلاف مہم چلائیں گے۔ اور تمام درباری کہتے ہیں کہ آپ نے ٹھیک فرمایا اور اس مہم میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مودودی صاحب حنفی فقہ کی تضحیک کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن حنفی علماء کو کنز الدقائق، ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ نہیں مل سکے گی اور درباری جواب دیتے ہیں کہ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ اور کچھ عرصہ بعد انہی اجداد کے علم و تقویٰ کا واسطہ دے کر حلالہ جیسی مردود چیز تحلیل کے نئے نام سے جواز پیش کرتے ہیں تو سب درباری یک زبان ہو کر فرماتے ہیں کہ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ سود فوجداری جرم ہے۔ سب درباری اس پر صاد کرتے ہیں۔ لیکن صاحب تفہیم القرآن فرماتے ہیں کہ جس چیز کو حضور صلعم اپنی زبان مبارک سے سود قرار دے گئے ہیں یعنی زمین کی بٹائی وہ جائز ہے۔ تو سب درباری آمنّا و صدّقنا کہتے ہیں۔ صاحب تفہیم القرآن فرماتے ہیں کہ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں نابالغ کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور نابالغوں کی شادی کے عملی نتائج ہم نے خراب ہی دیکھے تو دربار سے آمنّا و صدّقنا کی صدا بلند ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اپنے اس فیصلے کو قرآن کے صریح حکم کے خلاف قرار دیتے ہیں کہ وہ بالفاظ صریح نابالغوں کے نکاح کو جائز قرار دیتا ہے۔ تو پھر بھی وہی آمنّا و صدّقنا کی آواز۔ قرآن کہتا ہے کہ جنگی قیدیوں کے معاملہ کی دو صورتیں ہیں کہ یا تو انہیں بطور احسان یا بدلہ لے کر رہا کرو۔ اور جو لونڈیاں پہلے سے موجود ہیں (قرآن نے اس کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے) ان سے ازدواجی تعلقات نکاح کے بعد قائم کرو۔ لیکن مودودی صاحب کہتے ہیں کہ قرآن کے اس حکم پر عمل کی ضرورت نہیں۔ جنگ میں دشمن کی جو عورتیں ہاتھ آئیں انہیں بغیر نکاح کے استعمال میں لاؤ۔ اور تمام درباری اَحۡسَنۡتَ کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ قرآن کی تفسیر جیسی سنجیدہ کتاب میں عورتوں کو بنیادی حقوق کے مساوی مواقع فراہم کرنے والوں کو شیطان کے شاگرد قرار دیتے ہیں تو درباری خوشی سے اچھل پڑتے ہیں اور پھر جب اسی صنف کو ملک کا سب سے اعلیٰ انتظامی و سیاسی عہدہ سونپنا عین اسلام بتاتے ہیں۔ تو سب درباری تن من دھن سے اس کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہم نے مودودی صاحب کے دربار کو 'خدائی دربار' اس لئے کہا ہے کہ خود مودودی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتے ہیں۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں تفہیم القرآن جلد اوّل پر تبصرہ۔ انشاء اللہ دوسری جلد پر تبصرہ بھی جلد ہی قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

طلوع اسلام

مودودی صاحب کی تفسیر "تفہیم القرآن" پر تبصرہ کے لئے یوں تو ہمیں ایک عرصہ سے قارئین کی طرف سے فرمائشیں بلکہ اصرار موصول ہو رہے تھے، لیکن جب اس تفسیر کی تکمیل کے بعد اسے' زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کے لئے

جماعت اسلامی نے اس کے پراپیگنڈہ کے لئے اپنے مخصوص حربے استعمال کرنے شروع کئے تو اس اصرار کی شدت اور بھی بڑھ گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے اس پر قلم اٹھانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس کی بڑی وجہ ایک تھی۔ ہماری تفاسیر کے متعلق عام شکایت چلی آرہی ہے کہ ان میں اسرائیلیات کی خرافات اور دیگر ہر قسم کا رطب و یابس بھرا ہوتا ہے۔ یہی کیفیت مودودی صاحب کی تفسیر کی بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اس میں زبان اس جرنلزم کی استعمال کی ہے جس فن کے وہ ماہر ہیں۔ لہٰذا اس تفسیر پر کما حقہٗ تبصرہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام مقامات کو سامنے لایا جائے، جو ان خرافات کے حامل ہیں۔ اور ایسا کرنے کے لئے ظاہر ہے کہ ایک مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہوگی۔ اور اس قسم کے مہمل کام کے لئے ہمارے پاس وقت کہاں؟ ان خرافات کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ سورۂ بقرہ میں ہاروت و ماروت کا ذکر آتا ہے، اس کی تفسیر میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:

> اس کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لئے بھیجا ہوگا جس طرح قومِ لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے اسی طرح بنی اسرائیل کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازار ساحری میں اپنی دوکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمام حجت کے لئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہاری آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔
>
> فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔
>
> (تفہیم القرآن - جلد اوّل - طبع اول - صفحہ ۹۸)

فرمائیے! جس "تفسیر" کی کیفیت یہ ہو اس پر تبصرہ تضیع اوقات نہیں تو اور کیا ہے۔ باقی رہا اس مفسر قرآن کا قرآنی "مبلغ علم" سو اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ فرشتے جب اور جہاں جی چاہے انسانی شکل اختیار کر کے لوگوں کے سامنے آسکتے ہیں؛ اور قرآن کریم میں ان ملائکہ کے متعلق جو میدانِ جہاد میں نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین کی مدد کے لئے نازل ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے بصراحت خبر دیا کہ لَمْ تَرَوْهَا (۹/۲۶) "تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے"۔ اللہ تعالیٰ تو فرشتوں کے متعلق یہ فرماتے ہیں اور مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ جب جی چاہے انسانی شکل میں سامنے آسکتے ہیں۔ پھر ان سے یہ بھی پوچھئے کہ قرآن میں یہ کہاں

لکھا ہے کہ قوم لوط کے پاس فرشتے بشکل انسانی آئے تھے؟

۲۔ "شاہد عادل" نے اس تفسیر پر تبصرہ ایک خاص نقطۂ نگاہ سے کیا ہے یعنی انہوں نے بتایا ہے کہ یہ تفسیر کس قدر تضادات کا مجموعہ ہے۔ اور ان تضادات کو بھی انہوں نے بعض احکام تک محدود رکھا ہے۔ اگر ایسے احکام سے آگے بڑھ کر حقائق تک لیجایا جائے تو تضادات کے ایسے ایسے نادر نمونے سامنے آئیں کہ آپ محو حیرت رہ جائیں۔

۳۔ ضمناً غلام اور لونڈیوں کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب جنگ میں گرفتار شدہ عورتیں سپاہیوں میں تقسیم کردی جائیں تو ان سپاہیوں کو ان پر حق ملکیت حاصل ہو جاتا ہے۔ اور

> ملکیت کے تمام دوسرے حقوق کی طرح وہ مالکانہ حقوق بھی قابل انتقال ہیں جو کسی شخص کو از روئے قانون کسی اسیر جنگ پر حکومت نے عطا کئے ہوں۔ (تفہیم القرآن۔ حصہ اول۔ طبع اول۔ صفحہ ۳۴۰)

آپ سمجھے کہ "حق ملکیت کے انتقال" سے عملاً کیا مفہوم ہے؟ یہ کہ وہ سپاہی ان عورتوں کو جنسی تصرف میں لانے کے بعد جب جی چاہے اپنے کسی دوست کو تحفۃً دے سکتا ہے اور جب چاہے انہیں فروخت کرسکتا ہے۔ فروخت کرنے کے سلسلہ میں وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

> اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لیکر دوسرے شخص کی طرف منتقل کردیتا ہے۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۳۲۳)

جیسا کہ تبصرہ نگار نے لکھا ہے، غنیمت ہے کہ مودودی صاحب کی یہ خرافات دوسری زبانوں میں ترجمہ نہیں ہوئیں۔ ورنہ آپ سوچئے کہ اگر یہ "اسلامی احکام" خدانکردہ، خدانکردہ، ہندوؤں کے ہاتھ لگ جائے تو جو ہماری عفت مآب خواتین آج، ہزاروں کی تعداد میں انکی قید میں ہیں، ان کا کیا حشر ہو۔ اور آپ اس کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہہ سکیں جب وہ کہیں کہ یہ تو ہم خود آپ کے اسلام کے مطابق کر رہے ہیں۔ یہ ہے، بہرحال، نمونہ اس تفسیر کا جس کے متعلق آج اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ

"قرآن مجید کی تفاسیر سینکڑوں نہیں ہزاروں موجود ہیں۔ لیکن جب ایک شخص ان تفاسیر کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ قرآن کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ اسے ان تفاسیر میں آجکل کے مسائل کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ ایسے دور میں ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلام کو موجودہ زمانے کے حالات اور مسائل کی روشنی میں پیش کیا جائے اور قرآن پاک کو آجکل کی عام فہم زبان میں پیش کیا جائے کہ اس کے مطالعہ سے انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات دور ہو جائیں اور اس کا سینہ اسلام کی روشنی سے منور ہو جائے۔ اس ضرورت کو مولانائے محترم کی اس تفسیر تفہیم القرآن نے بحسن و خوبی پورا کیا ہے۔" (جنگ کراچی۔ ۶ نومبر ۱۹۶۶ء)

ہم نے اوپر اس تفسیر سے جو دو مثالیں پیش کی ہیں ان میں سے پہلی مثال قرآن مجید کے اس مقام سے متعلق ہے (یعنی قصہ ہاروت ماروت سے متعلق) جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے دل میں عجیب عجیب شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ کیا مودودی صاحب کی تفسیر سے اس مقام کے متعلق شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں یا (معاذ اللہ معاذ اللہ) قرآن اضحوکہ بن جاتا ہے۔ دوسرا مقام ایک ایسے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے جس نے ہمارے زمانے میں خاص اہمیت حاصل کر رکھی ہے یعنی جنگی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کا مسئلہ۔ آپ غور فرمائیے کہ اس کا جو حل مودودی صاحب نے بتایا ہے اسے آپ دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں یا آپ کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں؟

یہ ہے سطح اس تفسیر کی اور وہ ہے ایک جھلک اس پراپیگنڈہ کی جو اس کے متعلق کیا جا رہا ہے۔ (اقبال کے الفاظ میں) کس قدر (معاذ اللہ) مظلوم ہے بے چارہ قرآن بھی جسے اس قسم کے مفسر ملتے ہیں اور ان کے مداحوں کے متعلق کیا کہا جائے۔